TIGHT BINDING BOOK

TEXT CUT WITHIN
THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222684
UNIVERSAL LIBRARY

OUP—43—30-1-71—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱ک d ۳۱۰۹ Accession No. U523

Author نشتر، مرزا جعفر علی

Title تذکرہ آب بقا

This book should be returned on or before the date last marked below.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیرہ رجب

مرتبہ

جناب مرزا جعفر علی صاحب نشتر لکھنوی

فہرست مضامین

Checked 1975

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تمہید	۳	۱۶	حکیم مسیحا	۱۱۵
۲	شاہ اختر	۵	۱۷	مرزا حاتم علی مہر	۱۱۸
۳	خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی	۱۱	۱۸	شیخ امام بخش ناسخ	۱۲۶
۴	اسیر مغفور	۳۲	۱۹	میر نفیس لکھنوی	۱۳۷
۵	میر برشتہ دہلوی	۳۷	۲۰	نواب خلد آشیاں	۱۴۶
۶	جلال مرحوم	۴۱	۲۱	وسیم خیرآبادی	۱۵۰
۷	مرزا بہادر [illegible]	۵۰	۲۲	مومن دہلوی	۱۵۵
۸	جناب رشید لکھنوی	۵۳	۲۳	یقین دہلوی	۱۶۱
۹	حضرت ریاض	۶۲	۲۴	دربار رامپور	۱۶۳
۱۰	پیر و میر	۶۷	۲۵	یاران گذشتہ	۱۷۴
۱۱	صفیر بلگرامی	۸۴	۲۶	امیر و داغ	۱۷۷
۱۲	شہنشاہ ظفر	۸۹	۲۷	جانعالم کی شاعری	۱۸۶
۱۳	جناب عارف مرحوم	۹۹	۲۸	مشاہیر شعرا کے مزار	۱۹۴
۱۴	منیر مرحوم	۱۰۴	۲۹	شعرا کے مزار	۱۹۷
۱۵	میر مونس مرحوم	۱۱۲	-	- - -	-

UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD ۴۸۶

تمہید

ہندوستان میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا۔ جو اخبارات اور رسالجات دیکھنے کا شوق رکھتا ہو اور جناب مولوی منشی خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کو نہ جانتا ہو۔ کوئی ایسا مشہور شاعر اور مستند انشا پرداز نہیں ہے۔ کہ جو لکھنؤ میں آیا ہو اور ان سے ملاقات نہ کی ہو۔

ہندوستان کا کوئی معتقدر رسالہ ایسا نہیں جس نے کوئی نہ کوئی مضمون خواجہ صاحب کا شائع نہ کیا ہو۔

عموماً نامور لوگ یا تو نثار ہوتے ہیں یا شاعر۔ مگر ہمارے خواجہ صاحب میں دونوں اوصاف بحدِ کمال موجود ہیں آپ کی نثر سلکِ گوہر ہے تو نظم عقدِ ثریا۔ نثر آبِ حیات ہے تو نظم جامِ کوثر ایک موہن بھوگ ہے تو دوسری مَن و سلوا۔ ایسے مردِ میدان بہت کم ہیں جو دونوں معرکوں میں دلیری کے ساتھ قدم رکھ سکیں۔ خواجہ صاحب جس برجستگی کے ساتھ نظم کے دریا بہا دیتے ہیں اسی مستند معلومات سے نثر کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی واسطے آپ کی نظم و نثر دونوں مقبولِ عالم ہیں

آپ کا سلسلہ تلمذ خاندان ملک الشعرا میر دہلوی سے ہے میر کے فرزند سید محمد عسکری عرف میر کلو عرش کے شاگرد رشید شیخ محمد جان شاد پیر و میر لکھنوی آپ کے اُستاد تھے۔ پیر و میر اس لئے مشہور ہوئے کہ آپ گیارہ برس کے سن میں میر کی خدمت میں غزل لے کر حاضر ہوئے۔ تو اُستاد نے دستِ شفقت شاگرد کی پیٹھ پر پھیرا اور اپنے فرزند کی شاگردی میں دیدیا۔ پیر و میر مشہور عروضی تھے۔ اور بغیر عروض و قافیہ پڑھائے کسی کو اپنا شاگرد نہیں کرتے تھے۔ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ رفتہ رفتہ خواجہ صاحب کا کلام مقبول عام ہوا۔ لوگ اس کی نقلیں محفوظ رکھنے لگے اور بعض احباب نے مجھ سے اصرار کیا کہ اگر مختلف مضامین جمع کئے جائیں تو دنیائے ادب میں ایک کثیر

اضافہ ہوگا میں نے کئی برس کی مشقت اور تلاش سے کلام مرتب کیا۔ میری ترتیب کی پہلی کتاب "سیر اودھ" ہے جس میں اودھ کے بادشاہوں کے حالات، خاندان اودھ کے اُمراء کی کیفیت، محلات شاہی کی فیاضیاں، لکھنؤ کی تمدنی حالت، شہر کی آبادی اور عمارات قدیم کا تذکرہ ہے۔

اس کے بعد "صرف نحو" کے مختلف مضامین مرتب کئے۔ چند مضامین اردو کی حمایت میں لکھے تھے۔ ان کو علیحدہ مجموعے میں جمع کیا۔

تعلیم نسواں کی غرض سے چند چھوٹے چھوٹے قصے سلیس عام فہم نثر میں خاص عورتوں کی زبان میں لکھے تھے۔ ان کو جدا ترتیب دیا۔ اور اس مجموعہ کا نام "ہمجولی" رکھا

غزلیں جس قدر مطبوعہ غیر مطبوعہ دستیاب ہوئیں۔ اُن کو دیوان کی صورت میں لکھا۔

ظرافت کے پیرائے میں جتنے نظم و نثر مضامین شایع ہو چکے تھے اُن کو کتابی جامہ پہنایا۔

یہ کتاب جس کا نام "آب بقا" ہے لکھنؤ اور دہلی وغیرہ کے بعض شعرا کا مفصل اور جامع تذکرہ ہے۔ ان شعرا کے حالات تو اور مصنفوں نے بھی لکھے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب نے اپنی خاص تحقیقات سے مزید حالات بہم پہنچائے ہیں اور کلام کا انتخاب شاعرانہ حیثیت سے کیا ہے۔

آخر میں خواجہ عشرت صاحب کی نیچرل نظموں کا مجموعہ بھی اسی کے ساتھ شامل ہے۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ بہت سے شعرا کے حالات اور بہت سی نیچرل نظمیں جو مختلف رسالوں میں شایع ہو چکی تھیں دستیاب نہ ہوئیں تاہم اس کتاب میں نظم و نثر کے بہت سے جواہر مجتمع ہیں۔ اور اردو زبان کے محاورات، اصطلاحات حاصل کرنے والوں کیلئے ایک عمدہ ادبی مونہ کتاب ہے۔ جو کچھ اس مجموعہ میں ہے سب ٹکسالی زبان ہے اور طلباء کیلئے بھی کارآمد ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ملک میں دلچسپی سے دیکھی جائیگی۔

یہ شکر کا مقام ہے کہ خواجہ صاحب کی تصنیف میں سے ایک کتاب "زبان دانی" صیغۂ تعلیم گورنمنٹ بنگال نے تمام ہائی کلاسیس کے طلبا کیلئے منظور فرمائی۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی طلباء کیلئے کارآمد ثابت ہوگی اور صیغۂ تعلیمات میں داخل ہو جائیگی۔ طلباء کو اس کتاب سے نظم و نثر کا اچھا سبق حاصل ہوگا۔ نیز مختلف شعرا کے مستند کلام سے صنایع، بدایع، استعارات، تشبیہات، امثلہ، محاورات پر عبور حاصل ہوگا۔

سرائے میوہ۔ لکھنؤ
مورخہ یکم جنوری ۱۹۱۸ء

احقر مرزا جعفر علی نشتر عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آب بقا

شاہ اختر

ہمارا دعوےٰ ہے کہ حضرت سلطان ابنِ سلطان خاقان ابنِ خاقان ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر سابق شاہ اودھ اُردو کی ہر صنف میں قادر الکلام تھے اور نظم کے ہر صیغے میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔

شاہی میں مشاعرے نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گُل و فوارہ کی ہوتی تھی۔ کمرے میں تمام سامان عیش تیار رہتا تھا دریچیاں سبز/سرخ کاشانی مخمل کی جن میں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی۔ چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے۔ جھاڑ، جھا، بے، کنول، فانوس شام سے روشن ہوگئے۔ پردوں میں بنت، گوکھرو، لچکا ٹنکا ہوا۔ چاروں طرف قدِ آدم آئینہ بندی۔ مشاعرے عام نہ ہوتے تھے۔ مشاعرے میں ہمیشہ اہلِ دربار شریک ہوتے تھے۔ اور کبھی خاص اعزائے بادشاہ مدعو ہوتے تھے

شاہ سے مرزا خورم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر مرزا رفیع الشان بہادر نواب مجید الدولہ عظمت الدولہ مرزا سلیماں قدر بہادر دارا سطوت۔ مرزا

حیدر بیشا پوری تشریف فرما ہوئے اور اپنے اپنے مراتب کے موافق دہنے بائیں بیٹھے بیچ میں مسند پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں ۔

خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری لچکے گیٹے کے ہار الائچیاں چکنی ڈلیاں عطر کے کنٹر رکھے ہوئے گلی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے۔ ملازمین اٹھالے گئے ۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا ہر ایک نے غزل پڑھی ۔ اور یہ پر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم ہوگئی ۔ اہل دربار کا مشاعرہ ہر مہینے میں ہوا کرتا تھا ۔ اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پر لطف ہوتی تھی ۔ گرمی کے دن ہیں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے ۔ قناتیں گھیری جاتی ہیں پھولوں کے گلدستے منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں مکلف فرش بچھایا جاتا ہے ۔ قناتوں پر بیلے کے ہار پھیلے ہوئے ہیں ۔ اہل دربار اپنے اپنے قرینے سے مودب بیٹھے ہوئے ہیں' یہ کون ہیں ؟ مدار الدولہ علی نقی خاں بہادر وزیر' یہ کون ہیں ؟ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برق' یہ کون ہیں ؟ آفتاب الدولہ قلق' یہ کون ہیں ؟ تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیر ۔ یہ کون ہیں ؟ مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں ثابت جنگ قبول' اسی طرح تمام درباری تشریف لائے ۔ اور اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوتے ۔ اتنے میں حضور جانعالم برآمد ہوئے ۔ تمام اراکین سروقد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ ۔ بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی ۔ حضور مسند زرنگار پر باجاہ وجلال جلوہ افروز ہوئے ۔ مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا ۔ اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں ۔ علی قدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی ۔ سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا ۔ رؤسا اور امرائے شہر کے بہت سے مشاعرے ہوتے تھے ۔ مگر حضور کبھی کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے ۔ فتح الدولہ برق نے اور منشی اسیر نے بادشاہ کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں ۔ جو مشہور عام ہیں ۔ یوں تو بادشاہ کا کلام بہت ہے ۔ مگر اس وقت ہمارے سامنے کلیات مبارک ہے ۔

حمد باریتعالیٰ

تری الفت میں ہر سلطاں کو رتبہ ہو گدائی کا　　　سوا تیرے کسے زیبندہ ہو دعویٰ خدائی کا

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں اچھا ہو　　　زباں نے خاصہ پیدا کیا ہے مومیائی کا

ولہ

پابند دل ہوا جو تمہارے خیال کا — ہر دم ہے پیشِ چشم تصور جمال کا

ولہ

ہر عاشقِ دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا — وہ شمع تجلی ہے یہ پروانہ ہے اس کا

ولہ

بخش دے گا نامۂ اعمال کو رب کریم — دستِ عصیاں میں جو تو اپنا لکھائے جائیگا

عارض کی صفت

عارض صاف ترا رشکِ قمر دیکھ لیا — جان ہی آگئی جب ایک نظر دیکھ لیا
جو شب کو کوٹھے پہ وہ چاند بے نقاب آیا — چھپا ہالۂ فلک اس قدر حجاب آیا

ولہ

بیاضِ رخ سے آئینہ کی قلعی کھل گئی بالکل — سواد زلف پر دھوکہ ہوا ہے مجھکو سنبل کا
آنکھیں ہیں نرگس ہیں رخسار رخِ گل ہیں — چھوتا ہے ہونٹوں کو یہ سیب ذقن تیرا
رخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا — ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا
گالوں پہ جو ابھی یار کے بالا نہیں رہتا — شب کو کبھی مہتاب پہ ہالا نہیں رہتا

ولہ

اے آفتاب حسن ترا آفتابہ ہے — سورج کو منہ دھلانے کا لوٹا بنا دیا

زیور کی تعریف

کان کی بالی سے دل چھپا کر ہوا ہے خار دار — ناک کا تنکا ہماری آنکھیں کھٹکا کیا

عشق و محبت

الفت نے تری ہم کو تو رکھا نہ کہیں کا — دریا کا نہ جنگل کا ہوا کا نہ زمیں کا

ولہ

مری زبان سے پوچھو مزا محبت کا یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا
نصیب فتح ہو یا ہو مجھے شکست اختر خدا بچائے ہوا سامنا محبت کا

ولہ

دل گویا کو ترے عشق نے خاموش کیا یادِ غیروں کی ہوئی مجھکو فراموش کیا

ولہ

محبت کا بندہ بنا لیجیئے گا مرا دل بھی نامِ خدا لیجیئے گا
ابھی امتحانِ محبت نہ کیجے کبھی تیغ سے آزما لیجیئے گا

ولہ

مرا مبتلا بنا دے اے خدا الفت کی مٹی کا تو نسیتانہ رہجائے کوئی پھر حوصلہ دل کا

دل کی حالت

عجیب کوچہ ہے اپنے جی کا کہ پاؤں ٹکتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں اُس کی دل لگی کا یہ دل بھی معشوق ہے کسیکا

ولہ

بلاؤ دل جو بگاڑ ابنائے گا پھر کیا؟ اُجاڑتا ہے رعیت بسائے گا پھر کیا؟

ولہ

اتنی چاہت سے بھی دل بے سروساماں ہوگا راحتِ کم کے سبب رنج فراواں ہوگا

ولہ

دل ہدف ہوگیا ہے تیر کے سبحان اللہ کیا کماں وار تھا وہ اور نشانہ کیا تھا

ولہ

آنسو بہے رخسار پر دل نے مجھے رسوا کیا

دنیا کی ہوس

ہوس بڑھتی ہے اتنی جسقدر یہ عمر گھٹتی ہے ضعیفی کہہ رہی ہے کوئی کمسن ہو تو میں آؤں

ولہ

گئی بہار نہ کر الفت زن و فرزند خزاں چمن میں ہوئی موسم خضاب آیا

ولہ

طالعوں نے پست کی آخر بلندی حرص کی دفن ہمراہ خزانہ آپ بھی قاروں ہوا

فلک کی شکایت

ارمان دل میں رہ گئے بوس و کنار کے کیا چرخ نے بٹھا دیا مجھکو ابھار کے

متفرق

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا چمن اُداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا
ابھی لگاتے تھے مہندی جو تم گلستاں میں تمہارا پاؤں مرے دل میں تھا لگن میں نہ تھا
غرور کا جو کیا استمال اختر نے کلام کبر زباں پر نہ تھا دہن میں نہ تھا

ولہ

اختر اس بے مہر سے ناحق وفا کا دھیان ہے تو نے کیسا خیال خام اے ناداں کیا

ولہ

نہ کیونکر بلبل شیراز مرقد میں پھڑک جائے جہاں قائل ہے اے اختر تمہاری خوش بیانی کا

ولہ

مجھی کو واعظا پند و نصیحت ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

ولہ

کچھ لطف خوشی ہے نہ مجھے خوف الم کا
حسرت ہے نہ راحت کی نہ دھڑکا ہے ستم کا
حیراں ہوں میں ان دو نو میں ترجیح کسے دوں
ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا

ولہ

زور سے غیر نے آکر در جاناں مارا
دیو نے منہ پہ پرے تخت سلیماں مارا
ان نگاہوں کے تئے ہم سا بہادر ڈھونڈو
دل کو مارا تو کوئی رستم دستاں مارا

ولہ

ہمارے سامنے جب شوخ مہ لقا آیا
گلے لگا لیں یہی دل میں بار ہا آیا

ولہ

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا
نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ احوال کھلا

ولہ

درد آیا جو سینے میں پھر غم نہ نکلا
جو سمجھو تو مجنوں سے میں کم نہ نکلا

ولہ

جس نے تجھے پیدا کیا
اس نے مجھے شیدا کیا

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

زبان کے قواعد اور کلیات انہیں اصطلاحات و محاورات سے بنتے ہیں جن کا استعمال مستند فصحا کی زبان پر ہوتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ صرف نحو زبان کے تحت میں ہے نہ زبان صرف نحو کے تحت میں ہر زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے باقی تمام صوبہ اس کے ماتحت ہوتے ہیں مرکز وہی شہر قایم ہوتا ہے جو سلطنت کا پایہ تخت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بادشاہ اپنے ملک کی زبان کی پرورش میں فیاضیاں کر کے اہل مستند نثار اور شعرا کو جمع کر لیتے ہیں اور وہ زبان کو اپنے صحیح مذاق سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں اس لئے اکثر یہ ہوا ہے کہ پایہ تخت کے پاس زبان کا بھی دارالسلطنت قایم ہوتا ہے۔ اردو زبان فی نفسہ ایک شیریں اور دلکش زبان ہے ہر زبان کے حرف اسمیں شامل ہیں اور یہ خود سنسکرت زبان سے ماخوذ کی گئی ہے اسکی خوبی اس میں ہے کہ فارسی اور عربی ترکیبوں اور اضافتوں سے اس کو پاک صاف رکھا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو علم ادب لکھنؤ میں دہلی سے آیا اور اس بدیہی امر میں انکار کرنا سخت احسان فراموشی ہے یا یہ کہئے کہ دہلی کا ٹکسال لکھنؤ میں اٹھ آیا اس لئے کہ دہلی جن لوگوں سے عبارت تھی وہ سب شہزادے اور شاعر اپنی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی کے زمانہ میں دہلی کو سلام کر کے لکھنؤ چلے آئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ لکھنؤ کے دربار میں ان کی توقیر اور عزت حد سے سوا ہوئی۔ ملک الشعرا میر تقی میر لکھنؤ میں معہ اہل و عیال کے چلے آئے اور زندگی بھر مفتی گنج میں رہے اور اب بھی وہیں سو رہے ہیں۔ ملک الشعرا مرزا رفیع السودا لکھنؤ مینا بازار میں آکر بسے اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ انشاء اللہ خان انشا لکھنؤ میں آئے اور فراشخانے میں رہے اور حسین گنج میں آئینہ بی بی کے باغ میں دفن ہوئے۔ میر حسن، میر خلیق، میر جعفر زٹلی، صاحبقران، میر تقی، ہوس، میر سوز، طالب علی خان عیشی یہ سب کہاں رہے کہاں دفن ہوئے وطن کو چھوڑ کر غربت میں وہ آرام پایا کہ مر کے بھی لکھنؤ سے نہ نکلے۔ اس قدر دانی کا یہ صلہ ملا کہ لکھنؤ نقش ثانی بن گیا۔ اور اب تک اسکا وقار زبان اردو کی تحقیق میں اتنا ہی ہے جتنا شاہی میں تھا۔

جب دہلی کے لوگ مر چکے تو خدا نے لکھنؤ کی سرزمین میں بھی ایسے لوگ پیدا کئے جن کی شہرت اور زبان دانی کے نقارے تمام ہندوستان میں بج گئے۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ میں اردو علم ادب کی تاریخ کا زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے آتش کے واقعات اور اُن کی اردو کی مستقل خدمت کا احسان تمام ہندوستان پر ہے۔ اردو علم ادب کے ایسے محسن کا ذکر ہر طرح ملک کیلئے مفید ہے۔

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص تھا۔ آبا و اجداد قدیم باشندے دہلی کے تھے۔ شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش درویش سالک (جو خواجہ زادوں کے خاندان سے تھے) دہلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغل پورہ میں قیام کیا۔ پیری و مریدی کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی پر اوقات بسر ہونے لگی۔ اس زمانہ میں دہلی اُجڑ رہی تھی۔ عالمگیر ثانی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب سوائے اودھ کے اور کوئی مقام نہ تھا۔ جہاں آسائش سے بسر ہو سکے۔ تھوڑے زمانے کے بعد بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ بہادر کو شکست ہوئی جس کا رنج بہت کچھ ہوا۔ اس لحاظ سے کوئی شکست بکسر کا نام بھی نہ لیتا تھا اس اثنا میں فوج مغلیہ سے بادشاہ بدظن ہو چکے تھے۔ آتے ہی تمام فوج کو برطرف کر دیا مغل لوگ فیض آباد سے شاہجہانپور چلے گئے۔ اس سبب سے مغل پورہ بہت ویران ہو گیا۔ ہر چند مغلوں نے خواجہ علی بخش سے چلنے پر اصرار کیا لیکن خواجہ صاحب کی یہاں اچھی طرح بسر ہو رہی تھی۔ اس سبب سے کہیں نہ جا سکے۔ اس اثنا میں جناب عالی (نواب شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خانخانان کی پوتی سے کی جس میں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۹ء کا ہے۔ ابھی یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔ باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت۔ ابھی لڑکا اچھی طرح جوان نہ ہونے پایا تھا اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے۔ اُس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی۔ آتش کو بہادری دکھانے کے بہت سے مواقع ملے مغل بچوں کی صحبت میں تیغ زنی بہت اچھی آ گئی تھی۔ آدمی تھے جیوٹ کے بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے کمسنی سے تلوریے مشہور ہو گئے۔ سیکڑوں تلواریں کھائیں۔ ہزاروں ٹانکے لگے۔ اس جوہر کے قدردان فیض آباد میں نواب میر محمد تقی تھے جو آتش کو نوکر رکھکر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ انہیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنو آئے۔

اُس وقت میں ناسخ اور آتش کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہم کبھی لکھنؤ میں شاعری کے زمرے

میں آ نیگے اور ایک مشہور اُستاد کے نام سے مشہور ہوں گے۔ سردی کے زمانہ میں شب کو نواب صاحب کے ہنبٹی پردے اوڑھ لیتے تھے اور دن کو تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔

آتش گورے شکیل وجیہ چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے۔ آدھا سر مُنڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے (اُس وقت اچھے بانکوں کی یہی وضع تھی۔ اور ان کو اک پٹے جو ان کہتے تھے) کھانڈا باندھتے تھے۔ بھٹیارن کی دوکان پر چرس کا دم لگا رہے ہیں کسی نے ان کو دیکھ کر کھنکارا یا سامنے سے مونچھ اونچی کرتا ہوا نکلا بس غضب آگیا تلوار کھینچ لی اور کہا آؤ ہمارے تمہارے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

لکھنؤ میں آکر رفتہ رفتہ آتش کی صحبت بدل گئی۔ ان کو کتب بینی کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے۔ اسی زمانہ میں ان کو مذاق سخن پیدا ہوا۔ اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ناسخ بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ تھوڑے ہی زمانے کی مشق میں روزمرہ کے محاورے اور صفائی زبان میں اُستاد سے سبقت لے گئے۔ اس مدت میں نواب میر تقی کا انتقال ہوگیا۔ آتش کے شاگردوں کی جمعیت بڑھنے لگی۔ اور کلام کی شہرت ہونے لگی۔

نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی مشہور ہے وہاں سے اُتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا۔ اور اسی میں رہنے لگے مکان لینے کے بعد آتش نے اپنا نکاح کسی شریف خاندان میں کر لیا۔ تھوڑے زمانے کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام آپ نے محمد علی رکھا۔ ان کی بیوی بہت نیک عورت تھی ان کی وارستہ مزاجی اور اس کی گرہستی نے ملکر گھر سنبھال لیا۔ عقد سے پہلے تو آتش کو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا جب بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہو جاتے تھے۔ لیکن نکاح کے بعد بی بی کے پس انداز کرنے سے میاں فاقہ کشی سے بچ جاتے تھے۔

مولوی صادق علی کہتے تھے۔ آتش کو میں نے دیکھا ہے گیروا تہہ بند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک چھپلہ سوئے کا رہتا تھا۔ دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھپلہ رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے تھے۔

سپتے کام کا سلیم شاہی جوتا ایک اٹھنی کی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے۔ کبھی شاگرد سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے۔ اور اکثر اپنی دولت دعوت اور ضیافت میں لٹا دیا کرتے

تھے۔ کچھ تنخواہ اودھ کے بادشاہ کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ چار دن میں خرچ کر ڈالتے تھے۔
منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم شاگرد نسیم دہلوی کہتے تھے ہم نے جس وقت آتش کو دیکھا کوئی ستّر برس کے قریب ہونگے۔ ایک بالشت سے زیادہ ڈاڑھی تھی۔ مہندی کا خضاب کرتے تھے معالی خان کی سرا میں رہتے تھے ایک لنگوٹ باندھے ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر جو زمین دوز تھا تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے بیچ میں کچا حقہ سامنے رکھا رہتا تھا۔ جو کوئی امیر غریب آتا سب کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش ہوتا۔

وارث علی خان اُن کے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے۔ مزاج میں توکل تھا۔ جو کچھ آتا اس کو اُسی روز خرچ کر ڈالتے تھے۔ دوسرے روز کے لئے کچھ نہ رکھتے تھے جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہتے۔ ایک روز رسالہ دار فقیر محمد خاں گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آج کل بہت تکلیف میں ہیں کچھ روپیہ لیکر گھر پر آئے دروازہ بند تھا۔ آواز دی۔ اندر سے آواز آئی۔ کون ہے' یہ بولے فقیر۔

آتش نے کہا فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے) دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھلوا ان کا لڑکا بہت کمسن تھا۔ کوٹھے پر کنکوا اڑا رہا تھا سامنے بلایا اور اُس کا کنکوا' چرخی' ڈور دیکھکر کہا۔ یہ کنکوا تو اچھا نہیں ہے کتنے لیتا ہوگا ڈور بھی اچھی نہیں سستی ہے۔ دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں کہ تو بھئی اس کا ڈور کنکوا منگانا۔
آتش اس بات کی تہ کو پہنچ گئے کہ خانصاحب مجھکو زیر بار احسان کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ خاں صاحب آپ کو چاہئے تھا اس کو تادیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہتا نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں۔ یہ کہکر پانچ روپئے نکالکر لڑکے کو دیئے اور کہا خاں صاحب کو سلام کرو۔ اس کی چیز کھانا۔ باقی روپئے خان صاحب کے واپس کر دیئے۔ گھی میں تلی ہوئی مرچیں کھایا کرتے تھے۔

مولوی فصیح اللہ صاحب وفا کا بیان ہے کہ اس زمانے میں جو مشاعرے ہوتے تھے انمیں ایک قافیہ لازمی قرار دیا جاتا تھا۔ طرح مقرر ہوئی۔ ع

اپنے بیمار سے بھاگو نہ مسیحا ہو کر

اس میں "میلا" کا قافیہ لازمی قرار دیا گیا۔ جو قافیہ لازمی ہوتا تھا اُس پر سب شاعر زور دے کر کہتے تھے۔ نواب سید محمد خان رند نے اس میں غزل کہی۔ اصلاح کے واسطے لائے اور کہنے لگے

اُستاد مشروطہ قافیہ تو میں نے اپنے حصہ کا لکھا ہے۔ پھر بہت ناز سے پڑھا ؎

اگر بی بی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہوکر

تمام غزل پر اصلاح دی اور کہا ذرا ٹھہرو سید آتا ہوگا (صبا سے مراد ہے) اس کا قافیہ بھی سنتے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میر وزیر علی صبا آئے۔ آتش نے پوچھا۔ غزل مشاعرے کی لائے ہو۔ عرض کیا جی ہاں۔ کہا پڑھو۔ صبا نے کہا نواب صاحب بیٹھے ہیں ان کے سامنے میں بھلا غزل پڑھ سکتا ہوں۔ کہنے لگے کیوں کیا نواب صاحب چور ہیں۔ اچھا ایک قافیہ "میلا ہوکر" پڑھ دو۔ صبا نے کہا ؎

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہوکر

کہنے لگے دیکھئے نواب صاحب شعر اس طرح کہتے ہیں۔

شیخ فضل احمد کیف کہتے ہیں ایک مرتبہ طرح ہوئی زوال نہیں، انتقال نہیں، اس میں "بول چال" کی قید تھی۔ ہمیں بھی طرح کا مصرعہ آیا۔ غزل کہی۔ خواجہ صاحب کو قید کا قافیہ جب سنایا تو کہنے لگے اب کی بار غزل تمہیں پڑھنا۔ تم نے قافیہ خوب کہا ہے ہیں تو نہ پڑھو نگا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

نواب معتمد الدولہ بہادر ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مشاعرے بہت دھوم دھامی ہوا کرتے تھے اکثر آتش کو بھی بلواتے تھے۔ یہ اسی بانکپن سے اکڑتے ہوئے جاتے تھے تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے خدا خیر کرے۔ ایسا نہ ہو مشاعرے میں خون کی ندیاں بہہ جائیں۔

دونوں مشہور شاعر اور دونوں کے شاگرد بے شمار۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ کیا تمام شہر میں مصرعہ طرح تقسیم کر دیا لیکن آتش کو ایک روز پیشتر مصرع طرح بھیجا۔ آپ نے فرمایا شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے جو طرح عین وقت پر بھیجی۔ خیر یوں تو ہم آتے نہ آتے مگر اب جانا ضروری ہے۔ غزل کہی۔ تلوار کمر سے لگائی۔ بانکے دار ٹوپی دی۔ شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرے میں داخل ہوئے دیکھا تو معتمد الدولہ نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے۔ اُسمیں مشاعرہ کیا ہے۔ آپ نے مکان کو دیکھ کر فی البدیہہ یہ مطلع کہا۔ جب اُنکے سامنے آیا تو پڑھا ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکان ہے
زمین جس کی چہارم آسمان ہے

مطلع تھا موقع کا دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی۔ معتمد الدولہ نے اسی وقت خلعت دیا اور بہت عزت کی۔

آتش کے شاگردوں میں ایک نواب اصغر علی خاں صاحب اصغر بہت خوشگو شاعر تھے مگر وارستہ مزاج غزل پڑھنے کے بعد پھینک دیتے تھے۔ اکثر لوگوں میں ان کے شعر آتش کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک یہ شعر بہت مشہور ہے۔

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جب میر تقی میر نے انتقال کیا تو سعادت علی خاں کا زمانہ تھا۔ آتش کا سن اسوقت اکتالیس برس کا تھا بہت رنج کیا۔ اس لئے کہ میر صاحب ان کی بہت قدردانی کرتے تھے آتش اور ناسخ کی شاعری میں جتنا فرق تھا اتنا ہی مزاج میں تفاوت تھا۔ آتش رند اور متوکل آدمی تھے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک امیر غریب کو برابر سمجھتے تھے اور دنیاوی ساز و سامان کی چنداں طمع نہ تھی۔ ناسخ مرفہ حال تھے اور لوگوں کی ان کے مرتبے کے موافق عزت کرتے تھے۔ امراکی آؤ بھگت سوا تھی اس لئے کہ اکثر رئیس ان کے شاگرد ہوتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد جو غریب ہوتے تھے ان کو سفارش کرکے کہیں نوکر رکھوا دیتے تھے۔ اور حد سے زیادہ دنیا سازی کرتے تھے۔ لوگوں کا رجوع ان کی طرف زیادہ ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ نواب معتمد الدولہ بہادر ان کے شاگرد ہوئے۔ تو ملک میں ان کا اعزاز اور وقار زیادہ ہو گیا۔ آتش نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی فقیری کی اینٹ لی۔ ایک لنگوٹ بھنگ کا سونٹا اور چاروں ابرو کا صفایا گھر سے نکلنا کم کر دیا گیرو سے کپڑے پہننے لگے مگر وہ فقیری بھی بادشاہت سے بہتر تھی۔ آرام سے اپنے گھر میں فکرِ سخن میں موتی پرو رہے ہیں کسی نے آواز دی دل چاہا تو دروازہ کھول دیا نہیں تو صاف جواب دیا اس وقت آرام میں ہیں۔

خواجہ محمد علی جب تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے تو عینِ شباب میں شعر کہنے لگے۔ جوش تخلص رکھا گیا مچھلی کے بچوں کو کون پیرنا سکھاتا ہے۔ چند روز میں اچھے مشاق ہو گئے۔ آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے۔ غالب جنگ کے بیٹے جے دیال جو آتش کے شاگرد تھے مُصر ہوئے کہ آپ جوش کی شادی کر دیجئے۔ آتش نے عذر کیا کہ فقیر کی

کی کیفیت تمکو معلوم ہے شادی حوصلے کے موافق ہونا چاہیے۔ لائق شاگردوں نے ہاتھ باندھکر عرض کیا: آپ اپنے کفو میں نسبت ٹھہرالیں۔ شادی کا سامان مناسب مہیا ہو جائیگا۔ آتش کی غیرت نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ آخر بار بار کے تقاضوں سے تنگ آکر جوش کی نسبت ٹھہرانا پڑی۔ شادی کے دھوم دھامی جلسے کے لئے دلارام کی بارہ دری لے لی گئی۔ تمام دوست احباب شاگرد و عزیز مدعو ہوئے بہت معقول انتظام تھا۔ سارا خرچ جے دیال نے نہایت حوصلے سے کیا جب محمد علی نوشہ بنکر آتش کے سامنے آئے تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاگردوں نے عرض کیا اُستاد یہ وقت خوشی کا ہے خدا نے آپ کو بیٹے کا سہرا دکھایا۔ خدا کا شکر بھیجیے بدشگونی نہ کیجیے۔ ان کی اولاد سے خدا آپ کی نسل قایم رکھے۔ کہنے لگے میں اس بات پر روتا ہوں کہ محمد علی کی والدہ جو خوش ہونے والی تھی وہ زندہ نہیں ہے۔ جو اپنے بیٹے کو دولھا بنے ہوئے دیکھے۔ میں آنکھوں سے اندھا ہوں صورت دیکھ نہیں سکتا۔ یہ کونسا خوشی کا مقام ہے خیر تم لوگوں کو خدا مبارک کرے۔

شیخ ناسخ کے مرنے کی خبر سُنی تو چیخ مار کر رونے لگے۔ لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے ہیٹی تھے ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دشمن کم ہو گیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو۔ ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا۔ شاعرانہ نوک جھوک کی اور بات ہے اور اتنا پرانا تو دشمن بھی نہیں ملتا۔

نواب محمد علی خاں قمر عرف نواب حیدا میاں نے خواجہ آتش کو دیکھا ہے اُس زمانہ میں خواجہ صاحب نابینا ہو چکے تھے۔ مکان میں ایک چھپر پڑا تھا۔ ایک کھٹولا بچھا تھا۔ اس پر بیٹھے رہتے تھے۔ نرکل کی ٹٹیاں سامنے بچھی رہتی تھیں۔

غازی الدین حیدر بادشاہ نے ایک مرتبہ اپنے وزیر معتمد الدولہ سے پوچھا ہمارے شہر میں کوئی نامی شاعر بھی ہے۔ عرض کیا شاعر تو بہت ہیں لیکن ان میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش بہت مشہور ہیں۔ ارشاد ہوا اچھا ہماری کوٹھی میں مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ معتمد الدولہ نے اس مشاعرے کی خبر ناسخ کو کر دی اور اُنہیں کی تجویز سے تاریخ اور مصرع طرح مقرر ہو گیا اور آتش کو ایک روز پیشتر چوبدار کے ہاتھ رقعہ طلب آیا۔

بہت پیچ و تاب کھا کر کہا معتمد الدولہ نے اچھا سلوک کیا۔ اب یہ شہر ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ کہکر گھر میں کہلا بھیجا کچھ شگون کی روٹی پکا دو ہم کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔ دوسرے روز علی الصباح ٹھر سے پیادہ پا نکل کھڑے ہوئے سنہری برج میں مرزا محمد تقی

مرزا حیدر صاحب بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے تھے۔ آتش کو دیکھ کر کہا اُستاد آج گھر سے کیوں نکلے آدمی بھیج کر بلوا لیا۔ آتش نے کہا ہمارا سلام کہہ دینا اور کہا ہم سفر کو جا رہے ہیں۔ مرزا محمد تقی یہ سُنکر خود بوچے پر سوار ہو کر آتش کے پاس پہنچے۔ راہ میں روک کر سب حال دریافت کیا اور کہا اُستاد آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچسو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے یہ کس کام آئیگا آپ دیکھ لیجئے گا۔ اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں لہو کی ندیاں بہہ جائینگی۔ مرزا صاحب دس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے۔ اُن کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے۔ اور شام تک غزل کہا کیے۔

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں۔ کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گذارش یہ ہے کہ گُدڑی خاص مرحمت ہو۔ یہ عرضداشت محل کے اندر پیش ہوئی اور اس عنوان سے پیش ہوئی کہ بادشاہ نے دستخط فرما دیئے حالانکہ شاہی دربار میں سوائے بادشاہ کے ولیعہد تک کو اجازت نہ تھی۔ شام تک اس مشاعرے کی شُہرت تمام شہر میں ہوگئی۔ آتش کے تمام شاگرد نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی خان، نواب نصرت یار خان، نواب سید محمد خاں رند، خلیل وغیرہ مرزا صاحب کے دولت کدہ پر جمع ہوگئے۔ شاہی مشاعرے کی طرح "منانہ کیا" "نشانہ کیا" تھی۔ شام کو جب یہ خبر آچکی کہ ناسخ معہ اپنے شاگردوں کے مشاعرے میں پہنچ چکے۔ تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار (کھانڈا) کمر سے لگائی۔ ایک تہمد آدھی باندھی آدھی اوڑھی ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکلے۔ پیچھے پیچھے آدمی چھتر لگائے ہوئے اس کے بعد رؤسا، امرا، شاگرد وغیرہ اس کے بعد پانچسو بانکا تلوار کمر سے لگائے۔ کٹنے مرنے پر تلے ہوئے۔ اس بات کے تمام لوگ قائل ہیں کہ مشاعرے میں آتش کے سامنے کبھی ناسخ کا رنگ نہیں جما۔ ان کا پڑھنے کا انداز، شعر کا رکھ رکھاؤ، ادا کرنے کے تیور کسی کو نصیب نہ تھے۔

آتش شاہی دولت کدہ میں داخل ہوئے تو دیکھا صدر بارہ دری کے اندر شہ نشین پر کرسی بچھائے ہوئے غازی الدین حیدر رونق افروز ہیں۔ ادھر اودھر ارکین سلطنت مختصر با ادب کھڑے ہیں آگے چلمن پڑی ہوئی ہے۔ بارہ دری کی بغل میں داہنی طرف ناسخ معہ اپنے شاگردوں کے بیٹھے ہیں بائیں طرف آتش کے واسطے جگہ ہے۔ بیچ کے درجے میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے مرزا محمد تقی صاحب آتش کو لئے ہوئے بیچ کے درجے میں چلے گئے۔ چوبدار نے عرض کیا حضور یہاں بیٹھنے کی

اجازت نہیں ہے۔ آپ نے عرض کر دیا وہ خاموش ہو رہا۔ آتش نے پہلے فراشی سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے۔ اور پھر دست بستہ عرض کیا حضور ایفائے وعدہ ہو۔

بادشاہ نے اشارہ کیا ایک خواص خاص گڑگڑی لیکر حاضر ہوا۔ پھر عرض کیا۔ اجازت ہے غزل شروع کروں۔ فرمایا "ہوں"

آتش گڑگڑی لیکر مشاعرے کے پیترے سے بیٹھے اور اسی ٹھاٹھ سے اپنی غزل پڑھنے لگے جس سے تمام سامعین وجد میں آگئے۔ اور بادشاہ کے دل پر ایک خاص اثر ہوا۔ سننے والے کہتے ہیں آج تک ایسی زوردار غزل خواجہ صاحب نے نہیں پڑھی۔ بعض شعروں میں ناسخ پر کھلی کھلی چوٹ تھی۔ جن کو بادشاہ سُنکر مُسکرائے سے

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ۔۔۔ کہتی ہے تجکو خلق خدا غائبانہ کیا
طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و جاہ ۔۔۔ ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا
ہوتا ہے سُن کے زرد جو نامرد مدعی ۔۔۔ رستم کی داستان ہے ہمارا فسانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

آتش کے سب شاگرد بائیں طرف بیٹھے تھے۔ اُستاد کی تعریف کر رہے تھے۔ ناسخ کے شاگردوں پر اس ادائے خاص کا بہت اثر ہوا اور دل کھولکر لوگوں نے تعریف کی۔ شاہی حکم سے دوسرا خلعت مرحمت ہوا۔ مگر اس شاعر درویش سیرت نے عرض کیا میری عزت وہی کافی ہے جو حضور نے خاص گڑگڑی مرحمت فرما کر دی ہے۔ یہ خلعت ناسخ کو مرحمت ہو میں اپنا صلہ پاچکا اور اسی تیور سے سلام کرکے خوشی خوشی گھر واپس آئے۔

تحسین گنج میں میاں تحسین علی خان خواجہ سرا کے یہاں مشاعرہ ہوا چلن بگڑا کفن گڑا اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور ہوئی۔

ولی عہدی کے زمانے میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ آتش کے شاگرد ہوئے سو روپئے ماہوار دیتے رہے۔ غزل اصلاح کو بھیجا کرتے تھے۔ آتش نابینا تھے غزل سُنکر شاگرد سے اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا۔ رفقاء سے بیان کیا۔ سب نے کہا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے۔ آتش نابینا ہیں۔ شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتا ہے۔ یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی۔ دوبارہ غزل آئی اس پر لکھدیا۔ ماشاءاللہ خوب غزل کہی ہے۔ اس

سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھدیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کردی اور کہا میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا جب غزل بناتا تھا تنخواہ لیتا تھا۔ اب اصلاح نہیں ہوتی تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو بھیجا آتش نے یہی جواب دیا علی نقی خان نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کرکے بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ خود معذرت کے لئے آتش کے مکان پر آئے۔

منشی قمر صاحب کہتے ہیں جب ہم نے دیکھا ہے تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی گورے دُبلے پتلے تھے سر پر بال لمبے لمبے تھے۔ جوڑا باندھتے تھے۔ موچھیں بڑی بڑی ڈاڑھی منڈی ہوئی ایک تہمد آدھی باندھے ہوئے آدھی اوڑھے ہوئے۔ مکان میں بیٹھے رہتے تھے۔ چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا ایسا متوکل آدمی آجتک دیکھنے میں نہیں آیا۔ خواجہ محمد بشیر کہتے ہیں ہم بہت کمسن تھے صفر کا مہینا تھا ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء تھا۔ آتش کی بیماری کی خبر مشہور ہوئی۔ خواجہ رکن الدین کے ساتھ ہم بھی آتش کی عیادت کو گئے۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ کا عہد سلطنت تھا۔ اور اسی سال سریرآرائے سلطنت ہوئے تھے۔

آتش کا مکان مادھولال کی چڑھائی پر تھا۔ جہاں رب جوتنے والی ٹیٹی ہے۔ کچا مکان تھا اس پر ایک چھپر پڑا ہوا۔ تقریباً اسی بیاسی برس کا ایک آدمی چاروں ابرو کا صفایا رنگ کھلتا ہوا چارپائی پر لیٹا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا یہی آتش ہیں۔ کچھ منہ سے کہنا چاہتے تھے آواز نہ نکل سکی۔ شاگرد لوگ نرکل کی چٹا بوریا سیون پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے پھر چلے آئے۔ اس کے آٹھ روز کے بعد سُنا کہ آتش کا انتقال ہوگیا۔ اور اپنے مکان میں دفن کئے گئے۔

معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۲۵۴ھ میں ناسخ کا انتقال ہوا اور ناسخ کے نَو (۹) برس کے بعد ۱۲۶۳ھ میں آتش نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ کسی شاعر نے "چراغ جہان" تاریخ وفات نکالی تھی۔

منشی اشرف علی اشرف نے آتش کی تاریخ وفات خوب لکھی تھی جس کا مادہ "مرد شاہ سخن" ہے۔ خواجہ محمد علی جوش کو بزرگ اور نامور باپ کے مرنے کا بہت کچھ صدمہ ہوا۔ اور صحبت مشاعرہ میں جانا موقوف کردیا۔ ابھی دو برس نہ گذرے تھے کہ یہ ہیضہ میں دفعۃً مبتلا ہوئے۔ اور دو دن میں تمام ہوگئے۔ رشک مرحوم نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی ہے

کجا ئی تو خواجہ محمد علی | زمیضہ گذرفتی افسوس حیف
دلت آتش داغ بابا بسوخت | چہ بر بان جگر رفتی افسوس حیف
پئے خدمت خواجہ حیدر علی | زدنیا بدر رفتی افسوس حیف
چنین گفت تاریخ فوت تو رشک | نبز و پدر رفتی افسوس حیف

شیخ محمد جان شاد پیرو میر مرحوم فرماتے تھے کہ آتش کو ہم لوگ بمقتضائے محبت "خوجی" کہتے تھے۔ ان کی شاعری میں آمد کا بہت حصہ ہوتا تھا جو کچھ کہتے تھے بے ساختہ کہتے تھے۔ ہر وقت شعر کی دھن میں محو رہتے تھے امیروں سے بطمع دنیا نہ ملتے تھے۔ غریبوں سے بیرخی نہ کرتے تھے بانکے تھے اور بانکوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ بہادروں کے کارنامے شوق سے سنتے تھے۔

آتش کے برابر کے شاعروں میں اس وقت شیخ امام بخش ناسخ کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن اس وقت کے اور شاعر بھی ان سے برابری کا دعوےٰ رکھتے تھے۔ گو زمانہ نے ان کو شہرت نہ دی۔ ان سب میں زیادہ خصوصیت سے نواب عاشور علی خان عاشور کا نام لیا جاتا ہے۔ جو شاعر گر مشہور تھے اور مصحفی کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ نواب طالب علی خان بہادر عیشی تھے۔ جو فارسی اردو دونوں میں قادر الکلام تھے۔ سید حسن عسکری عرف میر کلو عرش خلف میر تقی میر۔ نواب مرزا محمد تقی خان بہادر ہوس خلف نواب مرزا علی خان بہادر دہلوی۔ میر تقی ترقی میاں منصور، میاں سرور، میاں دلگیر وغیرہ لیکن آتش کی خوش گوئی اور لطافت زبان کا سب لوہا مانے ہوئے تھے اور ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتے تھے۔

آتش کا دیوان انہیں کی زندگی میں مرتب ہو کر چھپ چکا تھا۔ یہ غلط ہے کہ ان کا کلام تلف ہو گیا۔ ہمارے پاس دوسرا اڈیشن ۱۲۶۳ھ علوی پریس کا موجود ہے جس میں لکھا ہے:۔

اگرچہ سابقاً رو بروئے مصنف زیب طبع یافتہ بود حالا بار دیگر بسعی موفور و کوشش مشکور غزلیات بقیہ را در دیوان دوم اضافہ نمود و مع قطعات وفات مصنف ترتیب دادہ بتاریخ پانزدہم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ حلیہ اختتام پذیرفت۔

آتش کی شاعری نے زبان میں فصاحت اور سلاست کا عمدہ نمونہ دکھایا ہے۔ سلک تظلم میں بحر فصاحت کے موتی پروئے ہیں۔

شاہی زمانے میں بانکوں کی قدر تھی۔ اور بہادری کے کارنامے عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے نازک مزاج تنزیب کے کرتوں پر تلوار کھانے میں مشہور تھے مگر بات اٹھانا دشوار تھی ہتھیار

بندی کا عام رواج تھا۔ اچھے تلوار یئے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آتش بھی بانکپن اور آزادخیالی کا جوہر ساتھ لائے تھے طبیعت جنگ جو اور شوریدہ سر تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا ملکہ فطرتی تھا۔ بظاہر ایک فرمانروا کے محکوم تھے لیکن قانون کی نرم پالیسی نے ہر ایک کو خودمختار اور آزاد بنا رکھا تھا۔

عرب کے شاعروں کی طرح جو حالت پیش آتی تھی اور خیالات پیدا ہوتے تھے۔ ان کو اصلیت اور جوش وخروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے۔ اسی لئے اُنکی غزلوں میں بانکپن اور آزادی جانبازی اور شجاعت کے مضامین عمدہ پہلو سے ادا ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آتش صرف ایک فنی شاعر تھے نہ کسی کی مدح میں کبھی قصیدہ لکھا نہ تخت نشینی کی تاریخ کہی نہ مثنوی نہ رباعی نہ قطعہ نہ سلام نہ مرثیہ۔ مگر غزل گوئی کے بادشاہ تھے۔ پُرانی غزل گوئی کا رنگ بدل دیا۔ ادائے مطلب میں نمایاں ترقی کی جو ان کے کلام سے ظاہر ہے :-

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

حباب آسا (حباب کی طرح) میں دم بھرتا ہوں (بار بار ذکر کرتا ہوں) تیری آشنائی کا (تیری محبت کا) نہایت غم ہے (بہت غم ہے) اس قطرے کو دریا کی جدائی کا۔ (اس قطرے کو دریا سے جُدا ہونے کا)

لطف زبان تو یہ ہے کہ "دم بھرتا ہوں" ایک ایسا فصیح اور جامع محاورہ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں۔ دم بھرنا کے لغوی معنی سانس اندر کھینچنے کے ہیں۔ حباب کے لئے دم بھرنے کا لفظ بہت پُرلطف آیا ہے کہ اس میں بھی جب ہوا بھر جاتی ہے تو پھول جاتا ہے اور دم بھرنے کے معنی دعوائے محبت کرنے کے بھی ہیں جو شاعر کا مقصود ہے۔ آشنائی کے معنی محبت کے ہیں لیکن آشنا پیراک کو کہتے ہیں اس رعایت سے محبت کی جگہ آشنائی کا استعمال اچھا معلوم ہوتا ہے۔ معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ "ہمہ اوست" کے مسئلہ کو اس زبردست شاعر نے دو مصرعوں میں طے کر دیا ہے۔ اپنی ذات کو قطرہ بنایا ہے؛ اور خدا کو دریا قرار دیکر مسئلہ وحدت کو حل کیا۔ آسا کا لفظ غلط تو نہیں ہے لیکن آج کل اس کا استعمال بہت کم ہے۔ اب اردو زبان سے فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ نکلتے جاتے ہیں۔ آجکل حباب کی طرح اور حباب کے مانند بولتے ہیں۔ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اس کا استعمال کیا ہے۔ طرح اور مانند کا لفظ اس مصرع میں فصیح پہلو سے

۲ نا مکمل تھا ۔

تعلق روح سے مجھکو جسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی ہے

اس شعر میں یہ نصیحت کی ہے کہ محبت کرو تو اس کو نبھاؤ ناپائدار دوستی اچھی نہیں ہے جو اگلی وضعداریوں کے خلاف تھی ۔

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

حسن پری ہمارے معشوق (معشوق حقیقی) کا ایک جلوۂ مستانہ ہے جو اس کا دیوانہ ہے وہی ہشیار ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں ہمہ اوست کے مسئلے کو حل کیا ہے یعنی حسن پری بھی اسی کے جلوہ مستانہ میں سے ہے دیوانہ (شیدا) جو اس کا شیدا ہے۔ وہی ہشیار ہے۔ یہاں مراد ہے اہل اللہ سے۔ لفظی خوبیاں تو یہ ہیں کہ حسن پری اور جلوۂ مستانہ سے کوئی اچھا لفظ نہیں ملسکتا اور ہشیار اور دیوانے کی رعایت ہے۔ معنوی خوبیاں یہ ہیں کہ تصوف کے ایک وسیع مسئلے کو مثال میں سمجھا دیا۔ لیکن عیب یہ ہے کہ اس میں (کہ) زائد اور ضرورت شعر کے لحاظ سے آیا ہے اور چھوٹی سی تعقید بھی ہے یعنی مستانہ اس کا ہے جانانہ اس کا ہے چاہئے تھا ۔

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

گل عدم سے ہستی میں ہمہ تن گوش آتے ہیں۔ نالۂ بلبل نہیں ہے اسی معشوق حقیقی کا فسانہ ہے۔ گل کو گوش سے بہت نفیس اور نازک تشبیہہ دی ہے جو استادی کا اظہار کر رہی ہے ۔

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

آتش ساقی ازل کا شکرانہ کرتا ہے کہ اس کا پیمانہ مئے شوق سے لبریز ہے یعنی مست مئے شوق رہتا ہے۔ یہ قطع نہایت صاف اور فصیح ہے ۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اس شعر کی بے ساختہ آمد قابل دید ہے۔

ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو
مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا

اس شعر میں سب سے زیادہ یہ خوبی ہے کہ اس میں اس زمانے کے تمدن کا حال معلوم ہوگیا نیاریئے ایک پیشہ ور غریب لوگ ہیں جو سُنار کے یہاں کی خاک، گوڑ چُننے والوں کے کارخانے کی خاک اور برسات میں نالے، نہری کے کنکر پتھر لے کر کونڈے رکھکر پانی میں چھانتے ہیں۔ اس میں سے کچھ چاندی سونا جو اُن کے مقدر میں ہوتا ہے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی ان کا پیشہ ہے ؎

کیا ہے اپنے غنچہ سے دہن میں تو نے جو اسکو
شمیم گل ہوئی ہے ریشۂ مسواک سے پیدا

کیا ہے (پھیرا ہے) اپنے غنچہ سے دہن میں تو نے جو اسے پھیرا ہے تو ریشۂ مسواک سے شمیم گل پیدا ہوئی ہے۔ یا گل کی خوشبو آنے لگی ہے۔ اول تو اس میں ایک نازک محاورہ ہے کرنا (پھیرنا) کے معنی پر ریشۂ مسواک سے شمیم گل کا پیدا کرنا کتنی نازک بات ہے۔ دوسرے مسواک کرنے کے طریقے کو کس خوبی سے بتایا ہے جبیں ہندوستان کے طرز معاشرت کا بیان کرنا منظور تھا۔ یہ باتیں سوائے شعرائے عرب کے عجم کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

زلف کے حلقے میں اُلجھا سبزۂ گوشِ یار کا
ہوگیا سنگِ زمرد خال چشمِ مار کا

زُلف کے حلقے میں (خم زلف میں) سبزہ (آویزۂ سبز) جو کان کی بالی میں پہنا جاتا ہے یا بُندوں میں پڑا ہوتا ہے۔ سنگ زمرد ایک قیمتی جواہر ہے چشم مار (حلقۂ زُلف) سے مراد ہے۔ گوش یار کا سبزہ خمِ زلف میں اُلجھ گیا سنگ زمرد خالِ چشم مار ہوگیا۔ کتنی نازک تشبیہ ہے اور کس قدر بلند پروازی کی ہے ؎

پھول جو ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہے
ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

شاعر نے اپنی بہادری اور بانکپن کا کس نفیس پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے لوگوں کو اس کی طبیعت کا اندازہ ہوگیا ؎

تواضع دشمن جان کی زیادہ قتل کرتی ہے
خم شمشیر معشوقوں کا توڑنا ہے گردن کا

نھوڑانا (جھکانا) جو جان کے دشمن ہیں ان کی زیادہ تواضع بھی قاتل ہے بمعشوق کا گردن جھکا لینا شمشیر کا جھکنا ہے۔ جو بغیر قتل کئے نہیں اٹھتی۔ مراد یہ ہے کہ معشوقوں کا ناز بھی آفت ڈھاتا ہی یہ صائب کے اس شعر کا جواب ہے ؎

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی است
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

کیا عمدہ مثال ہے۔ پھر اس فصاحت سے ادا کیا ہے جس نے ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنا دیا ؎

ادب تا چند اے دستِ ہوس قاتل کی دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

بندش کی صفائی قابلِ دید ہے ؎

کڑا پن آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داؤد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

اسی شاعری نے ان کو صائب بنا رکھا تھا ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

کتنی پاکیزہ بندش ہے ؎

شاہراہِ ہستی موہوم میں وہ چال چل
اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیرِ پا

شاہراہِ ہستی موہوم میں (دُنیا میں) وہ چال چل (وہ طرز اختیار کر) دوست دشمن اپنی آنکھیں زیرِ پا بچھا دیں (بے انتہا عزت کریں) اس مضمون کو شاعر نے کسی قدر تعقید کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن تخیل بہت پاکیزہ ہے۔ اور نصیحت کی نصیحت۔ آتش نے بہ تقلید شعرائے عجم اخلاقی بہت سے شعر کہے ہیں۔ جن میں عفت، شجاعت، ہمت، استقلال، توکل، استغنا کا بیان نہایت شوخ پیرائے میں ہے ؎

ملک الموت نے پیری میں کرم فرمایا
کشت پختہ ہوئی آتش کہ محصل دوڑا

شاہی میں زمینداروں سے سرکاری تحصیل چوتھ لی جاتی تھی جس وقت کھیتی تیار ہوتی تھی۔ عامل کی طرف سے تحصیلدار آتا تھا اور پیداوار کا چہارم حصہ حق سرکار لیا جاتا تھا۔ اسی سبب سے اس زمانہ کے زمیندار خوش حال تھے۔ خواجہ صاحب نے اسی رسم کا بیان اپنے مقطع میں کیا ہے کہ ملک الموت نے پیری میں قدم رنجہ کیا۔ جب کشت پک گئی (ضعیفی آئی) تو محصل (چوتھائی بٹانے والا) یعنی ملک الموت دوڑا۔ دنیا کی بے ثباتی کا بیان کس اچھے پہلو سے کیا ہے ؎

ہمیشہ شام سے ہمسائے مر رہے آتش
ہمارا نالۂ دل گوش کو فسانہ ہوا

ہمسائے (پڑوسی) مر رہے (سو رہے) ہمیشہ شام سے پڑوسی سو رہتے ہیں۔ ہمارا نالۂ دل اُن کے کانوں کو فسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ میں امرا، نواب زادے نیند آنے کے لئے داستان گو قصہ خوان نوکر رکھتے تھے۔ رات کو یہ بستر استراحت پر دراز ہوئے اور اس نے دو زانو ادب سے بیٹھکر دل آویز داستان شروع کی۔ رئیس کو اس کے سرود میں نیند آگئی۔ داستان گو رخصت ہو گیا۔ ہر ایک رئیس و امیر کے یہاں ایک داستان گو ضرور نوکر ہوتا تھا۔ آتش نے اسی طرزِ معاشرت کا بیان کیا ہے ؎

لگے منھ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

منھ چڑھانا (ٹیڑھا منھ کرنا) ایک معشوقانہ ادا ہے۔ صاحب معشوق سے مُراد ہے زبان بگڑی تو بگڑی (زبان خراب ہوئی تو ہوئی) خبر لیجئے دہن بگڑا یعنی مُنہ ٹیڑھا ہو گیا۔ اس شعر کے محاورے اور زبان قابل دید ہے "لیجئے" ذرا دیکر آیا ہے جواب متروک ہے ؎

ایذا جو ہو اس خال و گیسو سے تعجب ہے
وہ افعی بے دنداں بے نیش یہ عقرب تھا

اللہ غنی اس جدت تشبیہ کو دیکھئے گیسو کو افعی تو سب نے کہا ہے مگر افعی بے دندان آتش کا حصہ تھا۔ کیسی نازک تشبیہ دی ہے اور خال کو عقرب بے نیش کہنا بھی نئی تشبیہ ہے نازک خیالی کی حد کر دی ؎

اللہ رے ہمارا تکلف شبِ وصال روغن کے بدلے عطر جلایا گلاب کا

صیاد نے تسلّی بلبل کے واسطے کنج قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

ان شعروں سے طبیعت کی نفاست کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

لالہ رو کہکر لگاتے ہیں گل اندامُوں کو داغ

روزِ محشر شاعروں کا پوست کھینچا جائیگا

داغ لگانا (عیب لگانا) پوست کھینچنا عہدِ سلف کی ایک سخت سزا۔ بادشاہ نہایت سنگین مجرم کی کھال کھنچوا کر بھس بھروا کر شارع عام پر رکھ دیتا تھا کہ اور لوگوں کو عبرت ہو۔ لیکن یہاں شاعر نے مذاق طبیعت سے ایک سنگین سزا کا بیان کر کے تمدنِ سلف دکھایا ہے۔

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا

تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

کتنا صاف شعر ہے ؎

گلزارِ لطف و خُلق شگفتہ رہے مُدام

اس باغ کی بہار الٰہی خزاں نہ ہو

یہ بھی اخلاقیہ اشعار کا ایک نمونہ ہے ؎

کیا بادۂ گلگون سے سُرور کیا دل کو

آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

داتا رندانِ بادہ نوش کے محاورے میں خدا کو کہتے ہیں اور کبھی سخی کے معنوں میں بھی آتا ہے ؎ گور میں بھاگ اہل دنیا سے

خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

گور کو خلوت سے اور دنیا کو انجمن سے کیا اچھی نسبت دی ہے ؎

طور جس برقِ تجلا نے کیا خاک سیاہ

تیرے آتش کدۂ حُسن کی چنگاری ہے

کس قدر بلند پروازی کی ہے ؎

لاش پر لاش نکلتی ہے ترے کوچے سے

کیا تماشا ہے کہ بھیڑ نہیں چھٹتی ہے

تیری گلی سے لاش پر لاش نکلتی ہے۔ کیا تماشا ہے (کیا طلسمات ہے) کہ بھیڑ نہیں

چھٹی - کوئے یار میں عاشقوں کی کثرت کو کتنے اچھے پیرائے میں دکھایا ہے۔ مگر ردیف ذرا لپٹی ہوئی نہیں ہے ؎

گل ہر اک ساغر بکف بلبل ہر اک نغمہ طراز
سیرِ باغ آتش مجھے ایمائے ناؤنوش ہے

ہر ایک پھول ساغر بکف ہے (یہ مشابہت ہے شکل گل سے) بلبل گا رہی ہے باغ کی سیر گویا اشارہ ہے بادہ نوشی کا ؎

تری ابروئے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی استاد شاعر کی یہ بیتِ عاشقانہ ہے

ابروئے پیوستہ کو بیت عاشقانہ سے تشبیہ دی ہے ؎

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

پیامبر کے استعمال میں حال کے شعرا نے بہت غلطی کی ہے کہ اس کو نامہ بر کے معنی پر بھی باندھ گئے ہیں پیامبر کے معنی زبانی پیام لے جانے والا مطلب یہ ہے کہ اچھا ہوا کہ پیامبر نہ ملا۔ غیر کی زبان سے اظہار مطلب کیا کرتے ؎

نامرد آسماں سے گوارا ہے کس کو جنگ
آتش سپر کو چیرئیے تلوار توڑئیے

اس قسم کی مفاخرت عرب کی شاعری میں تو بہت کچھ ہے اُردو کی شاعری میں صرف آتش کے کلام میں ملتی ہے جس میں شاعر نے اپنی بہادری کا جوش و خروش سے اقرار کیا ہے یعنی آسمان نامرد ہے اس لئے دور سے ظلم کرتا ہے۔ سامنے نہیں آتا۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا کیا بہتر ہے۔ سپر اور تلوار کو توڑ کر پھینک دیجئے اس لئے کہ بانکے۔ بانکوں سے لڑتے ہیں ؎

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

کوہِ غم ٹوٹنے پر (غم کا پہاڑ گرنے پر) آہ ہے یاں کم ظرفی (آہ کرنا ہمارے لئے ذلت پن ہے) ٹھیس (ٹھوکر) سے کاسۂ چینی کو (چینی کے پیالے کو) فغاں کرنے دو (چیخنے دو) لفظی خوبیاں تو یہ ہیں۔ کوہِ غم فصیح محاورہ ہے (ٹھیس) ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی دو چیزوں کا

باہم ٹکرانا ہے۔ ٹھوکر لگ جانا ،چھو جانا معنوی خوبیاں ہیں۔ کہ عاشق اپنے استقلال کا بیان کرتا ہے کہ اگر کوہِ غم بھی ٹوٹ پڑے تو ہم آہ کرنا حرام جانتے ہیں۔ یہ چینی کے پیالے ہیں جو ذرا سی ٹھوکر سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ عیب یہ ہے کہ یاں اب متروک ہوگیا ہے۔ اس کی جگہ (یہاں) بولتے ہیں۔ اسی کو فصیح جانتے ہیں۔

غرض آتش کے کلام میں تشبیہات کی لطافت، استعارات کی نزاکت رنگ رنگ کے خیالات، تصوف کی جھلک، ہمت، توکل، استغنا کے عمدہ مضامین فلسفہ، معاشرت، اور خانگی زندگی کی خصوصیات، زمانہ کی رفتار، گفتار، نشست، برخاست، وضع قطع، بود وماند کے طریقے، زندگی کی ضرورتیں، جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، صحرا، جنگل، سبزہ زار، آبِ روان، شجاعت، جانبازی، کی جیتی جاگتی صورتیں نظر آتی ہیں، جن کا مقابلہ کرنے میں ان کے معاصرین عاجز تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم اُن کے بعض منتخب اشعار پیش کرتے ہیں:۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھکو — کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

محبت کا تری بندا ہر اک کو لے عدم پایا — برابر گردنِ شاہ و گدا کو ہم نے خم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں — غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

شام سے ڈھونڈا کیا زنجیر پھانسی کے لئے — صبح تک میں نے خیالِ گیسوئے پیچاں کیا

مری آنکھوں کے آگے آئیگا کیا جوش پر دریا — ہمیشہ صورتِ سائل ہے یاں آغوش میں دریا

جب سے شیطان کا احوال سنا ہے میں نے — پاسِ بت پر بھی ارادہ ہے جبیں سائی کا

اے فلک کچھ تو اثر حسنِ عمل میں ہوتا — شیشہ اک روز تو قاضی کی بغل میں ہوتا
عرش کی سیر ریاضت نے مجھے دکھلائی — دخل سرِ دور سے سلطاں کے محل میں ہوتا

نہ سُنی یار نے اک بات سخن سازوں کی — رہ گئے کھول کے منہ مفسدہ پرداز اپنا
یاد آتی ہیں ادائیں جو تری اے محبوب — بھول جاتے ہیں حسینانِ جہاں ناز اپنا
نہرِ اول و آخر نہیں عشق کا آتش — نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا

پھول جو ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہو
ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

اے صنم عاشق سے رو پوشی نہیں لازم تجھے
پردہ موسیٰ سے نہیں اللہ کو دیدار کا

ادب تا چند اے دست ہوس قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا

عالمِ منطق مصوّر ہو تری تصویر کا
منہ کتابی قطبی ہے خط حاشیہ ہے میر کا

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بوئے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھکو لگا کفن کا
خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مسرودِ دوستاں ہو
جدا ہوا شاخ سے جو پتّا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

شیریں کے شیفتہ ہوئے پرویز و کوہکن
شاعر ہوں میں یہ کہتا ہوں مضمون لڑ گیا
آتش نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا
سینے میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا

یہ دل لگانے میں میں نے مزا اٹھایا ہے
ملا نہ دوست تو دشمن سے اتحاد کیا

سبزہ بالائے ذقن دشمن ہے خلق اللہ کا
رہروؤں کی موت ہے خس پوش ہونا چاہ کا

نہ ڈرا مجھکو تو اے دوریِ کوئے محبوب
راہ میں مسلم مسافر کو ہے باران ہونا

ماتم دریا دلاں شادی تنک ظرفوں کی ہے
گریۂ مینا ہے باعث خندہ ہائے جام کا

سُنتا ہوں تختہ پھولا ہے نرگس کا باغ میں
آنکھیں لڑائیے جو ارادہ ہے جنگ کا

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے خوشی
عید ہے جس روز چھٹکارا ہوا محبوس کا

دانت ہلتے ہیں ہوئے ہیں موئے سر لاے سفید
گو ہنستی ہے سمجھکر مجھکو شایان مرگ کا

زعم میں اپنے یہ نافہم جو اُستاد ہیں سب
معترض ہو جئے تو قائل ایراد ہیں سب

قاتل اپنا جو کرے گنجِ شہیداں آباد
دہن زخم کہیں حسنا نہٗ احسان آباد

منکر ہیں ذات صانعِ عالم کے دہریئے
نا فہموں کا عمل ہے فقط لاالہٰ پر

مرے صنم کا کسی کو مکاں نہیں معلوم
خدا کا نام سنا ہے نشاں نہیں معلوم

رفیق حال بُرے وقت میں نہیں کوئی
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
ساکھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں
ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تو نے زیور میں
نگیں کو نام لے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

بے اعتبار نقش و نگار زمانہ ہے
اک رنگ پر ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی

خدا کی یاد جوانی میں غافلو کر لو
وگرنہ وقتِ فضیلت تمام ہوتا ہے

حسن وہ شے ہے کہ پتھر میں بھی کرتا ہے اثر
چشم عاشق کی طرح آئینے حیران ہو گئے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریئے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سُنکے حال
کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

بیوفائی کا اگر عیب نہ ہوتا تم میں
اے بتو سجدہ خدا کو نہ مسلمان کرتے

باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

اسیر مغفور

"بعض خود نوشت حالات"

حقیقت میں دیکھو تو دنیا میں کیا نہیں ہے سب کو فنا ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے وقفہ کم ہے اول بھی عدم ہے آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزم آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دنیا سے برخاستہ ہے زیادہ رہنے سے کیا۔ دنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز قریب اُٹھکر گوشہ لحد میں سو رہے جن سے دل بہلتا تھا وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ مغتنم تھے وہ پردۂ خاک میں نہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم نوالہ تھے اُنہیں کا ماتم کرنا پڑا جن کے لئے پوشاکیں قطع کیں انہیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا۔ اُنکے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے۔ اُن کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو زور میں ہر وقت ہم پنجہ رہتے تھے۔ اُن کو گور میں لٹایا۔ سرسبز چمن غارت پائمالی ہوا۔ بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ وہ ساقی۔ زندگی کا مزا جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے اس سرائے میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ جو آیا ہے اُسے ایک دن جانا ضرور ہے۔ نہ کوئی یار نہ غمگسار فقط مرگ کا انتظار ہے۔ ضعیفی میں جوانی کا مزا کہاں۔ ہم تو رہ گئے زندگی کا مزا جاتا رہا۔ اب کچھ اپنا حال بیان کرو۔ جو سُننے کے قابل ہے۔ قصبۂ امیٹھی جو آباد ہے۔ وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے۔ چمن ہے لیکن خزان دیدہ رفیقان صاحبِ حشم رئیسان عالی ہمم سب اُٹھ گئے۔ جب نو۹ دس برس کا سن ہوا بخت رسا لکھنؤ میں لایا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے محبِ نبیؐ و علیؑ شیعہ پاک و صاف اعتقاد عالی وقار بڑے فارسی دان حضرت عباسؑ علمدار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ مائل تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا۔ اُستاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے کبیدہ ہوا تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا۔ وہاں خوشنویسوں کا مجمع تھا۔ مجکو بھی شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعری کی ہوس ہوئی مضامین تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کرکے دیکھے پچھلوں کے رنگین کلام

یاد کیے بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجیے۔ چچا میر سید علی نے (جو علم خفی وجلی میں بہت دقاق تھے صرف ونحو میں منتخب روزگار تھے حکمت منطق میں بے مثل حدیث قرآن پر شیفتہ آپ نے جلاء العیون نظم کرکے دادِ سخن دی تھی۔) میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا فکر قوت میں اضطراب ہوا پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ القصہ کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشا گری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے خدا کی شانِ رزاقی وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم سنائی پڑھا علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھکو بھی کامل کر دیا کبھی کبھی میر قائم علی سے پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایک متقی عالم ہیں۔ ترکِ عادت تو بہت مشکل ہے۔ شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا۔ جا بجا مشاعروں میں گیا۔ شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھکو شاعری میں کمال ہے۔ مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گزرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح شام سیر کی۔ لغت کی کتابیں پیش نظر ہیں۔ جب حضرت ثریا جاہ خاقانِ زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے۔ بڑے نیک طینت معین شریعت فرشتہ خصال تھے۔ تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذو الفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قد بنایا کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں ستایا صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔ رونق اسلام کی بڑھایا کیے۔ روز افزوں تائید خدا رہی۔ لیکن خاکساری بدستور قایم رہی یہاں کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔ جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا مکانات خرید کیے جب وزارت ملی تو ماہِ نو سے ماہِ کامل ہو گئے۔ خاندان کا خاندان تھا۔ مرزا اسکندر شکوہ کے مکانات ان کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لیے۔

از سر نو ان سب کی تعمیر کی۔ مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔ اسی جگہ باغ بندا ین تھا۔ وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ اس کو خوب تیار کیا اور "امداد باغ" نام رکھا۔ عجب عشرت آباد بن گیا۔ دوکانوں سے بازار شق القمر بن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔ بجز رونق دین اور کچھ حرص نہیں۔ ایک مجتہد لازم ہیں

صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ اللہ تقسیم زر ہوتی ہے۔ مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے اس کے قریب درگاہ حضرت عباسؑ علم بردار بنائی ہے۔ جہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں۔ زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی اُن کے بندوں میں ایک صاحبِ نیاز بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا۔ مجھکو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کٹے۔ کچھ حسبِ حال مقدرت حاصل ہوئی۔ جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے۔ اُن کے بخت و نصیب موافق رہے۔ خدا کا شکر و سپاس ہے۔ یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا۔ یہاں نہ تو حُسنِ صورت ہے۔ نہ حُسنِ خط ہے۔ املا بھی غلط۔ انشا بھی غلط۔ شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے۔ خدا ہمارے محسن پر احسان کرے۔

بعد ازاں گردشِ روزگار ہوئی۔ زمانہ کا تو کچھ اعتبار نہیں ہے۔ آسمان و زمین دوسرے ہو گئے فلک نے ہمیں خانہ نشیں کر دیا۔ کیا کہوں جو دورِ زمانہ ہوئے تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا۔ دل کو نہایت ملال ہوا میرے سر پر اس قدر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اُٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

میں یہاں نیک نام رہا۔ اب علی کی محبت میں تمام ہوں سخن مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحبِ سریر رونق افروز تھے۔ یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہے۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہے۔ اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں پایۂ تخت بلند رہے چشمِ بد سے گزند نہ پہنچے۔ مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گُلِ انتخاب تھی۔ میں نے حسبِ حکم اُسے نظم کیا۔ سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی اُن کی خوشی سے مطلب تھا۔ فقط یہاں تک اسیر مغفور کے خود نوشت حالات تھے۔

اسیر کے دادا کا نام سید محمد علی تھا ابنِ مولوی سید معین الدین ابنِ محمد صالح کروری۔ نانا ان کے لکھنؤ کے شیخ زادے تھے۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خان بہادر۔ بہادر جنگ دربار اختری سے خطاب ملا۔

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ اسیر صاحب زادگان عالی شان کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں

کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر زمانہ سلیمان سریر آصف مشیر حاجی حرمین شریفین ہلال رکاب نواب محمد کلب علی خان بہادر میں دربار سخن فہموں سے سجایا گیا۔ اور قدر دانی کا بازار گرم ہوا۔ اسیر بھی بیش بہا تنخواہ پر بلائے گئے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انہیں کا مرتبہ تھا۔ ہزارہا مستفید ہوئے۔ ایک دیوان فارسی گلشن تعشق اور چھ دیوان اردو میں ہیں۔ ریاض مصنف گلستان سخن دیوان اسیر عاشقانہ دیوان میں ایک دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستہ امانت ہے۔ ایک کلیات قصاید اردو ایک مثنوی درۃ التاج ہے۔ جو بادشاہ کی فرمایش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہے۔ ایک مثنوی معارج الفضایل معجزات ائمہ میں ہے ایک کتاب زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض وقوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت، رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہے۔ فواید مظفریہ علم نحو عربی میں ہے۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

مدت دراز تک مرثیہ اور سلام کہا کئے۔ مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا۔ ۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوئے اسی سال اسیر پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خان وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں اسیر بھی کچھ دن اسیر رہے۔

اسیر نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ بہت پرگو تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفی اکثر کہا کرتے تھے "ایک روز یہ آخری شاگرد استادوں کی صف اول میں جگہ لے گا۔"

اسیر جب واجد علی شاہ کے دربار میں رفقا کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے خطاب حاصل کیا تنخواہ مقرر ہوئی تو ہم چشموں میں اعزاز بڑھ گیا۔ شاعری چمک گئی۔ بہت سے شاگرد ہوئے۔ اسیر کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ بہت پرگو تھے۔ مضامین عالی نظم کرتے تھے۔ اصلاح بہت جلد دیتے تھے۔ جب انتزاع سلطنت ہوا اور بادشاہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ تو اسیر لکھنؤ نہ چھوڑ سکے یہاں ان کے قدردان بہت تھے۔ اکثر روسا امرا شاگردوں نے ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ کشیدہ قامت، گورے، کتابی رو، متوسط الجثہ تھے۔ اکثر ٹخنوں تک کا کرتا پہنتے تھے۔ رشک اور اسیر میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ باوجود کمال کے اسیر میں خود نمائی نہ تھی۔ شاعری کی طبیعت کی افتاد کا اندازہ ان کے کلام سے ہو سکتا ہے۔ ایک شعر میں اپنی

عادت کو نظم کرتے ہیں ؎

مثل ہلال بدر ہے کسبِ طالبِ خطر
وہ خود نما نہیں ہے جو صاحب کمال ہے

مزاج میں انکسار بہت تھا۔ اور اسی کو پسند کرتے تھے۔ ایک موقع پر نظم میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

جو افتادہ ہیں اُن کی ہر جگہ تعظیم ہوتی ہے
ہجوم خلق ہو ہر چند جائے سایہ خالی ہے

درحقیقت اسیر کے مزاج کی افتاد ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس میں کچھ تکلف نہ تھا۔ ہر کہہ و مہہ سے بہ تواضع پیش آتے تھے علم و فضل کا غرور نہ تھا۔ آخر یہ آفتاب شاعری ۱۲۹۹ھ میں غروب ہو گیا۔ اُن کے انتقال کی ایک تاریخ خواجہ محمد یوسف صاحب یوسف نے کہی تھی جس کا مصرعہ تاریخی یہ ہے ؎

ہاں مصحفی کی باقی تھی ایک یہ نشانی

غرض وہ زمانہ شاعری کے لئے بہت اچھا تھا جس میں اسیر۔ آتش۔ ناسخ وغیرہ اہل کمال پیدا ہوئے اور اپنے کمال کی قدر کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب نہ صاحبِ کمال ہیں نہ قدر دانِ سخن۔ اہل کمال ہیں بھی۔ تو اُن کے جوہری کہاں ہیں۔ بہت سے ہیرے اب پتھروں کے ساتھ تُل رہے ہیں۔ فقط

میر برشتہ دہلوی

شعرا مر گئے مٹ گئے ان میں کوئی ملک الشعرا تھا اور کوئی خدائے سخن۔ مگر ظالم فلک کو ان کی خاک پر بھی رحم نہ آیا۔ نشان قبر کو کس بے دردی سے پامال کر رہا ہے۔ لکھنؤ میں "پیر جلیلوں" کے نام سے عنایت باغ کی پشت پر ایک محلہ مشہور ہے۔ اس میں "پیر جلیل" کوئی بزرگ سید تھے۔ جو ابتدائے اسلام میں یہاں آئے تھے۔ ان کا مزار ایک بلند ٹیلے پر ہے۔ اس کے آس پاس بہت سی قبریں ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے محلہ میں قبریں ہی قبریں تھیں اور یہ ایک پرانا تکیہ ہے۔ لوگوں نے قبروں کو مٹا کر اپنے اپنے مکان بنا لئے۔ اور بہت سی ٹوٹی پھوٹی قبریں اب بھی موجود ہیں۔ جو قبر مکان کی چار دیواری کے اندر لے لی جاتی ہے پھر اس کا نشان تک معدوم ہو جاتا ہے۔ اب بھی جو قبریں اس دستبرد سے بچ رہی ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ محلہ کے اسیر ان پر اپلے تھاپتے ہیں۔ بہت سی غلاظت پڑی رہتی ہے۔ بعض آدھی بعض ثلث معدوم ہو گئی ہیں۔ اس تکیہ پر میں کئی مرتبہ گیا اور نہایت افسوس کے ساتھ واپس آیا۔ قبروں کی حالت زار اور ان کی نجاست مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ ان خفتگانِ خاک کے کچھ تاریخی حالات بھی معلوم ہوں۔ مگر کسی پر سنگِ تربت نہ ملا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ جس طرح "نادان محل" کے مقبرے کو میونسپلٹی نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اسی طرح اس قبرستان کے آثار قدیمہ کو بھی اپنی حفاظت میں لے لے تو کم سے کم مسلمانوں کے دل نہ دکھیں گے۔ اور مرحومین کی مٹیاں نجاست میں آلودہ نہ ہونگی۔ مجھے از حد تلاش تھی کہ اس قبرستان میں کسی مشہور آدمی یا کسی شاعر کی قبر کا پتہ لگے۔ مگر قرب و جوار کے رہنے والے جاہل لوگ کچھ نہ بتا سکے۔

ایک روز ایک بہت مسن نحیف الجثہ مرزا صاحب سے راہ میں نیاز حاصل ہوا تو میں نے اس قبرستان کی بابت دریافت کیا۔ فرمانے لگے مجھے اس تکیہ کا کچھ حال معلوم نہیں ہے اتنا جانتا ہوں کہ شاہی میں میرے والد یہاں ایک قبر پر فاتحہ پڑھنے آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے بزرگ استاد میر برشتہ دہلوی کا مزار پاک ہے۔ اکثر پھول وغیرہ بھی چڑھاتے تھے۔ اور اب تو یہاں وہ بے ادبی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ۔ یہ جاہل لوگ بہت غلیظ پھیلاتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو میر صاحب

کی قبر بھی یاد ہے، کہنے لگے اب تو کسے کی وہ صورت نہیں رہی۔ گر میں چلکر دیکھتا ہوں شاید سمجھ میں آجائے۔" پیر جلیل کے مزار کے قریب ایک شکستہ قبر تھی کہنے لگے گمان غالب اسی پر ہے۔ اس ٹیلے پر چڑھنا اُترنا اُن کے لئے ایک منزل سے کم نہ تھا نیچے اُتر کر قبر کی حالت پر بہت افسوس کیا۔ اور غمزدہ ہو کے پوچھا، آپ کو معلوم ہے ان کا نام کیا تھا، کہنے لگے، ہم نے نام تو نہیں سُنا لوگ "میر صاحب" کہتے تھے۔ پوچھا شاگرد کس کے تھے، کہنے لگے "میر تقی میر" کے شاگرد تھے۔ پوچھا آپ کو کلام یاد ہے۔ فرمایا دو ایک شعر سُنے تھے ؎

دیکھا جو اپنے در پہ برشتہ کو یہ کہا
کیا خانماں خراب کہیں تیرا گھر نہیں

اور اسی غزل کا مطلع بھی یاد آیا ہے ؎

ہنگامہ میری آہ سے کیا مرغ پر نہیں
وہ کونسی زمیں ہے جو اشکوں سے تر نہیں

دوسری غزل کا مطلع بھی کیا خوب ہے ؎

سُلگا کے دل کو عشق میں پہنچی جگر کو آگ
اے چشم تر بجھا کہ لگی سارے گھر کو آگ

ہم نے سُنا ہے کہ شاہی میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس میں مصحفی اور میاں مخمور بھی شریک تھے۔ میر برشتہ کا ایک شعر بہت پہلا تھا طرح تھی، لگائے بلبل، آئے بلبل، میر صاحب کا شعر ہے ؎

گوش گُل کے ترے نالوں نے نہ پردے کھولے
اب تو تالو سے زباں اپنی لگائے بلبل

میاں مخمور کا بھی ایک شعر اسی طرح میں بہت مشہور ہے ؎

پھر دی کنج قفس پھیر دی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھائے بلبل

برشتہ کا صرف ایک مطلع مجھے اور یاد ہے وہ سُنائے دیتا ہوں ؎

عشق میں جی کا ہے غم سر در پیش
ہیں اسی سوچ میں ہوں سر در پیش

میں نے کہا کہ میر صاحب کی کوئی اولاد تھی، کہنے لگے مجھے نہیں معلوم اتنا سُنا ہے کہ "مفتی گنج" میں رہتے تھے۔ زمانہ ناموافق تھا۔ میر صاحب نازک مزاج تھے، اور با وضع تھے پوچھا، کچھ صورت شکل آپ بتا سکتے ہیں؟ کہا میں نے دیکھا نہیں تھا جو کچھ حال سُنا تھا آپ سے کہہ دیا اور کچھ مجھے نہیں معلوم، میر برشتہ کا دیوان بعد چندے مجھے دستیاب ہوا وہ اشعار بھی موجود تھے۔ ایک غزل مطبوعہ "مجمع الاشعار" میں ملی جس کا مطلع یہ ہے ؎

جو مدرسۂ عشق میں مجنوں کا سبق تھا
سو اپنے وہ دیواں کا برآوردہ ورق تھا

اور چند اشعار دیوان سے انتخاب کر کے لکھے جاتے ہیں ؎

ماجرائے چشمِ تر ہرگز نہ کچھ افشا ہوا — اس قدر رویا قلم کاغذ کفِ دریا ہوا
جس قدر بدنام ہو عاشق وہ ہے نام آوری — پارسائے عشق وہ ہے جو کہیں رسوا ہوا

کیا دہانِ تنگ سے کچھ غنچہ تنگ آتا رہا — برگِ گُل تک اس لبِ نازک سے پیّاتا رہا
مسکرا کر اس نے مارا ہاتھ پر میرے جو ہاتھ — کیوں نہ ہاتھ اپنے ملوں دل ہاتھ سے جاتا رہا
رشتہ تقدیر اُلجھا جا کے زلفِ یار سے — پیچ پڑتے ہی گئے جوں جوں میں سُلجھاتا رہا
پھر نہ کوئی کاروانِ رفتہ سے یاں آیا پھر — ہر نفس مثلِ جرس میں گو کہ چلاتا رہا

اے برشتہ کس قدر تھا تیرے دل کو اضطراب
جان نکلی تن سے باہر تو بھی گھبراتا رہا

جان سے تنگ تھا دل کھول کے رونے ندیا — دامنِ وحشت بھی یاروں نے مجھکو سِنے ندیا

میرے لب سے جو ہوا نالہ بلند — حلقۂ گوشِ ثریا ہو گیا

خضر سے سن کے اس کے لب کی بات — منہ میں بھر لایا پانی آبِ حیات
آنے جانے پہ اس کے ہے موقوف — عاشقِ خستہ کی حیات و ممات
شعر کے فن میں اے برشتہ تجھے — نہیں معلوم کیا ہے معلومات

اتنا تو رحم کرنا مرے حال زار پر آنا کبھی تو فاتحہ پڑھنے مزار پر
اب اتنا تو پاس محبت ادا کر
کبھی دور سے دیکھ جایا کیا کر

ہائے لکھنؤ کی خاک میں دہلی کے کیسے کیسے زبردست شاعر غربت نصیب ہو کر سو رہے ہیں جن کا کوئی نہ پانی دینے والا ہے نہ رونے والا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان مزارات کو محفوظ رکھا جاتا۔ اور اُن کے کلام کو شایع کیا جاتا مگر اردو کے دلدادہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ان گرانما یہ موتیوں کو ضایع کر رہے ہیں بعد چندے ان لوگوں کا کلام بھی میسر نہ آئیگا میر صاحب کا دیوان بہت مختصر ہے اور کوئی غزل گیارہ بارہ شعر سے زیادہ نہیں ہے لیکن کل کلام منتخب ہے اور بالکل تیر و نشتر ہے۔ افسوس ہے مجھے ان کے اور حالات نہیں ملے اور نہ کوئی دہلی میں ان لوگوں کے حالات بتا سکتا ہے۔

کم سے کم ہم گورنمنٹ سے اتنی درخواست تو ضرور کریں گے۔ کہ "پیر جلیل" کے ٹیلے پر جو قبریں پس ماندہ ہیں ان کو اپنی حفاظت میں لے لے اور ان آثار قدیمہ کو قایم رکھے۔ قبروں کی یہ حالت دیکھ کر کہ اُن پر اُپلے تھاپے جاتے ہیں' ہر مسلمان کا کلیجہ منھ کو آتا ہے ہم تو ملحد کی قبر کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرنا نہیں چاہتے۔ کچھ قبریں ایسی ہیں جنکو لوگوں نے اپنے مکان میں لے لیا ہے۔ لیکن غریب برشتہ کی قبر پر فلک ناہنجار کا سلوک دیکھ کر ہر آدمی کا بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے' تعجب نہیں کہ اس تکئیے میں اور بھی شعرا کے مزار ہوں' مگر کون بتائے اور کس سے پوچھا جائے۔ کسی قبر پر تاریخ کا پتھر نہیں اور ہوگا بھی تو لوگ نکال لے گئے ہونگے' بہر حال جس قدر مستند شعرا کی قبروں کا پتہ چلتا ہے سب کا یہی حال ہے کہ نہ کہیں سنگ تاریخ ہے نہ مزار مسلم ہے شکستہ و ریختہ' ہاں صرف بیکسی اور غربت اُن کی ماتم دار ہے۔

جلال مرحوم

حکیم میر ضامن علی جلالؔ لکھنؤ کے مشاہیر شعراء میں سے تھے۔ آپ کے والد حکیم سید اصغر علی خاں عہد نواب یوسف علی خاں والیِ ریاستِ رام پور کے یہاں داستان گوئی کے عہدے پر ممتاز تھے۔ دادا حکیم سید حسن علی خاں حکیم شفائی خاں مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور شفاخانہ شاہی لکھنؤ میں بزمرۂ اطباء ملازم تھے۔ بعد وفات حکیم سید علی خاں اُن کے فرزند حکیم سید اصغر علی خاں کو شفاخانہ شاہی لکھنؤ سے تیس روپئے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ ان کا موروثی مکان "پار" میں تھا۔

حکیم ضامن علی جلالؔ نے مدرسہ شاہی میں تعلیم پائی عربی "میبذی" تک پڑھی اور فارسی کی کتابیں بجائے خود مطالعہ کیں۔

حکیم صاحب کو ابتدائے سن شعور سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے امیر علی خاں ہلالؔ کے شاگرد ہوئے۔ جو رشک مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ بعد چندے امیر علی خاں ہلالؔ نے آپ کو ہونہار دیکھ کر اپنے استاد رشک مرحوم کے حوالے کیا۔ رشک بھی اس وقت "پار" میں رہتے تھے۔ اور محقق شاعر تھے۔ جلالؔ ایک مدت تک اصلاح لیتے رہے۔ اس کے بعد رشک بغرض زیارت کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے اور وہیں قیام کیا۔ اب جلالؔ اپنا کلام بخشی الملک فتح الدولہ برقؔ کو دکھانے لگے۔

حکیم صاحب کی ولادت سنہ ۱۲۵۰ ہجری میں ہوئی۔ ابھی حکیم صاحب کی عمر بائیس برس کی تھی کہ سنہ ۱۲۷۳ھ میں غدر ہو گیا اور تمام شرفائے شہر تباہ ہو گئے۔ حکیم صاحب اپنے والد کے پاس ریاست رام پور میں چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد نواب یوسف علی خاں نے انتقال فرمایا اور یہ دونوں باپ بیٹے نواب کلب علی خاں بہادر کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ نواب کلب علی خاں بہادر بہت عقلمند رئیس تھے اور ان کو اپنی ملکی زبان کی خدمت ملحوظ خاطر تھی۔ ان کے دربار میں اُردو کے اچھے اچھے ثقات

سے لکھنؤ میں دریائے گومتی کے پاس مشہور محلہ ہے۔ مؤلف

شعراجع ہوگئے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر نواب کلب علی خاں بہادر دس بیس برس اور زندہ رہتے تو زبان کا مرکز بجائے لکھنؤ کے رامپور قرار پاتا۔ غالب اسی دربار کے متوسل تھے۔ اسیر مرحوم اسی دربار کے وظیفہ خوار تھے۔ شیخ امداد علی بحر۔ آفتاب الدولہ قلق۔ منشی محمد اسمٰعیل منیر۔ شہزادہ حیا دہلوی۔ میر یار علی "جان صاحب" آغا حجو ہندی لکھنوی۔ منشی امیر احمد امیر مینائی۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی۔ یہ سب لوگ اسی سرکار میں ملازم تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے کی شاعری ریاست رامپور کی فیاضیوں کی توقع پر ہوتی تھی۔

رام پور میں حکیم صاحب کی بہت قدر دانی کی گئی۔ حکیم صاحب نازک مزاج بہت تھے اور ان کو اپنی شاعری پر ناز بھی تھا۔ محاورات کی حفاظت کرتے تھے۔ اور روزمرّہ کے پابند تھے۔ اس وجہ سے وہ کسی کو اپنا ہم مقابل نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مشہور شاعر سے کہنے لگے۔ آج کل دو چار لونڈوں نے شاعری کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ شاعر نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے دو چار نام گنوا دینے کے بعد کہا۔ اور ایک "اللہ رکھے" آپ ہیں۔ شاعر صاحب صورت دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اور ادب سے کچھ نہ بولے۔

ایک مرتبہ حکیم صاحب کے اس شعر پر مولوی عبد الحق صاحب خیرآبادی کو وجد آ گیا ہے ؎

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا حال
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

چند مرتبہ ریاست رامپور سے مستعفی ہو کر چلے آئے مگر قدر دان نواب نے ایام معزولی کی تنخواہ بھی ادا کی اور ان کو پھر بلوا بھیجا۔ جلال مرحوم کو سو روپئے ماہوار ریاست رام پور سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر قصیدے پر دو سو روپیہ ملتا تھا۔ عید اور بقرعید میں تو قصیدہ ضرور ہی لکھا جاتا تھا۔ اور یوں بھی کسی تقریب پر قصیدہ کہکر پیش کرتے تھے۔

منگرول کے نواب حسین میاں بہادر شعرا کے بہت قدر دان تھے۔ جلال کو پچیس ۲۵ روپئے ماہوار مستقل بھیجتے تھے۔ اور ہر قصیدے پر سو روپئے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سال میں ایک مرتبہ اپنے یہاں مشاعرہ کرتے تھے۔ اس میں جلال کو بھی طلب کرتے تھے۔ اور سو روپیہ رخصتی کا دیتے تھے۔

شاہ مرشد علی صاحب بغدادی جلال کے شاگرد تھے۔ یہ بھی اُن کی مستقل خدمت کرتے تھے۔ مدراس کے نواب محمد حسین خاں ایمان بھی جلال کے شاگرد تھے اور کچھ تنخواہ بھی دیتے تھے۔ بشیر احمد خاں تعلقدار ملیح آباد حکیم صاحب کے شاگرد تھے۔ کچھ ماہوار خدمت کرتے تھے۔ حکیم صاحب کسی شاگرد کو بغیر منفعتِ مالی اصلاح نہیں دیتے تھے۔ اور کسی خط کا جواب نہیں لکھتے تھے جس میں جواب کے لئے ٹکٹ نہ رکھا ہو۔

غدر کے بعد جب حکیم صاحب لکھنؤ واپس آئے تو "یار" والا مکان مسمار ہو گیا تھا۔ اُس کا نشان تک باقی نہ تھا۔ آپ نے "منصور نگر" میں ایک مکان خرید کیا اور اس میں اپنے بیٹھنے کے واسطے ایک کمرہ بنوایا۔ اُس کمرے میں بیٹھکر لوگوں کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند تھے اور ایک لڑکی۔ بڑے فرزند "ننھے صاحب" تھے یہ بالکل اُمّی تھے دوسرے صاحبزادے حکیم سید محمد مہدی تھے۔ یہ شاعری میں کمال تخلص کرتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ اپنے باپ کے صحیح جانشیں تھے۔ لیکن افسوس ہے ان کی عمر نے وفا نہ کی اور باپ کے انتقال کے چند سال بعد خود بھی راہیِ ملک بقا ہوئے۔ حکیم صاحب کی نازک مزاجی سے چند دربار رامپور کے شاگرد ان سے ناخوش تھے۔ اور ان کا غرور توڑنے کے واسطے ایک پوربی طالب علم "ظہیر احسن شوق نیموی" کو تیار کر کے ان کا مدِمقابل بنایا اور حکیم صاحب کی کتابوں پر اسی سے اعتراض لکھوائے لیکن حکیم صاحب کے کمال میں کچھ فرق نہ آیا۔ اور لوگوں کی نظروں میں اُن کی وہی وقعت رہی جو ایک باکمال شخص کی ہونا چاہئے۔ حکیم صاحب سے ہم سے ملاقات تھی وہ ایک متنغ شخص ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ ہی باکمال آدمی بھی تھے اور انصاف پسند تھے۔ اہلِ کمال سے متواضع پیش آتے تھے۔ اور اپنی فروگذاشت کا اقرار بھی بہت جلد کر لیتے تھے۔ اور سخن فہم کی قدر کرتے تھے۔ اُن کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح نظم کرتے ہیں۔ اور وہ اس بارے میں اپنا مدِمقابل کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ عروض دانی میں ان کو اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ آفتاب الدولہ قلق مرحوم کے مکان پر ایک صحبت مخصوص شعرا کی ہر اتوار کو ہوا کرتی تھی۔ اُس میں ہم بھی شریک ہوتے تھے سب یارانِ یکدل تھے اور ایک دوسرے کی غلطی کو بے رو رعایت بتا دیتا تھا۔ اور سب لوگ خوشی سے اعتراض کو قبول کرتے تھے۔ حکیم صاحب کہتے تھے۔ اس وقت شہر میں کچھ رکیسون کی زبان مستند

---

۵ یہ لکھنؤ کا مشہور محلہ ہے۔ شاہی میں بہت آباد تھا۔ مولف

اور معتبر ہے۔ ان میں سے ایک نواب باقر علی خاں عروج اور نواب جعفر علی خاں سالم رئیس "شیش محل" بھی ہیں۔ اور فرماتے تھے۔ آج کل کے شاعر معلومات زبان اردو سے خالی ہیں۔ آپ نے زبان اُردو کی خدمت بہت کی ہے۔ چار دیوان تصنیف کئے۔ پہلا دیوان "شاہد شوخ طبع" دوسرا دیوان "کرشمہ گاہ سخن معروف بہ زبان حال" تیسرا دیوان "مضمون ہائے دلکش خیالات بیمثال" چوتھا دیوان "نظم نگارین حسن مقال"۔

ایک لغت تصنیف فرمایا جس کا نام "سرمایہ زبان اردو" ہے یہ لغت مبسوط محاورات اور کنایات اور امثال زبان اُردو کا ہے اور الفاظ کے اصطلاحی معنی بھی لکھے ہیں۔

"قواعد المنتخب" یہ ایک مختصر رسالہ زبان ہندی الاصل کے بعض مفرد اور مرکب الفاظ کی تحقیق اور تصریف کے بیان میں بہت مفید ہے۔

"مفید الشعرا" یہ تذکیر و تانیث کا ایک مشہور رسالہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب کی تصنیف سے ملک کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے رامپور سے واپس آکر بھی جناب جلال اکثر لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ نواب سید اصغر حسین فاخر کے یہاں ہر مہینے میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ طرح تھی ؎

"فاخر ہمارے گھر وہ آکر پلٹ گئے"

حکیم صاحب کے ایک شعر نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا ؎

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے

کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے

"دمہ" کا دورہ آپ کو سرما میں اکثر اٹھا کرتا تھا اور بہت طوالت پکڑتا تھا جس سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ دورے کی شدت تھی منگل کے دن ان کے فرزند اکبر "منے صاحب" نے پوچھا کچھ خط ڈاک میں ڈالنے کے ہوں تو مجھے دیجئے میں ڈال آؤں وہ اکثر خط لیکر ڈاک میں ڈال آتے تھے۔ آپ نے کچھ ایسے لفظوں میں جواب دیا۔ جو ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سمجھے شاید خط دینگے۔ کچھ دیر تک ٹھہرے رہے پھر کہا خط دیجئے۔ کچھ جواب نہ ملا۔ پاس جاکر دیکھا حکیم صاحب کا نزع کا عالم تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ یہ ان کو پکڑ کر گھر کے اندر لے گئے اور اپنی بہن کو خبر بھجوادی۔

۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء بروز سہ شنبہ بوقت ۱۲ بجے شب ستتر (۷۷) برس کی عمر میں حکیم صاحب

نے انتقال فرمایا۔ اور کربلائے "تال کٹورہ" لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

انتخاب کلام

جس نے کچھ احساں کیا اک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اُتارا سر پہ چھپّر رکھ دیا

مٹا دو خود اگر تقدیر کا لکھا مٹانا ہے
مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہو میری جبہہ سائی کا

بُت ہی بت کعبے میں ہم کو پہلے آتے تھے نظر
اب نہیں کوئی رہے نام اے جلالؔ اللہ کا

دلِ بیتاب کے پہلو سے جاتے ہی گیا سب کچھ
نہ پائیں سینے میں آہیں نہ آہوں میں اثر پایا
اُچھالا رات کو یوں اضطرابِ دل نے سوتے میں
کہ بستر پیٹھ کے نیچے نہ تکیہ زیرِ سر پایا
حبیب اپنا اگر دیکھا تو داغِ عشق کو دیکھا
طبیب اپنا اگر پایا تو اک دردِ جگر پایا

ساتھ کس کا کوئی دیتا ہے پریشانی میں
رنگ گلشن میں کبھی ہمسفرِ بو نہ ہوا

خدا کے سامنے ہم سے بتوں نے کیں چار آنکھیں
وہیں شرما گئے آخر جہاں بیباک ہونا تھا

وہ کافر بھی مرے تابوت کے ہمراہ ہو لیتا
کوئی کہہ دے کہ جاتا ہے جنازہ اک مسلماں کا
کسی کی انجمن میں ہم کو جب آنا بھی جھینپانا بھی
اِدھر تو داغ سودا کا اُدھر چاکِ گریباں کا

فرقت میں درد ایک مرا ہمنشیں رہا
اُٹھا بھی کھڑا ہوا تو وہیں کا وہیں رہا
اُٹھے جو بزمِ یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

مشغلہ ہے یہی اکثر دلِ سودائی کا
ڈھونڈھنا سینے میں پہلو مری رسوائی کا

کل تو دل پس پس گیا اتنا ہجومِ غم ہوا
یاد ہے زیرِ فلک ایسا بھی مجمع کم ہوا

سمجھ کے عشق میں لو امتحان بختِ جلال
تم اور حوصلہ تقدیر آزمائی کا

وہ پھر کے آپ تو آتا اگر جواب نہ تھا
پیام بر تھا الٰہی مرا شباب نہ تھا

برنگِ آبلہ ہم پھوٹ پھوٹ کر روئے — کسی کا چھیڑ کے کچھ پوچھنا بھی نشتر تھا

نہ آنکھ دیکھ سکی جب وہ بے نقاب ہوا — تحیّرِ نگہِ شوق خود حجاب ہوا

اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد — وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

عدو کو رنج نہ تم سے نہ آسماں سے ملا — تمہیں کہو یہ مقدر اُسے کہاں سے ملا

جانِ عاشق لی کسی نے کوئی رسوا ہوگیا — تم نے مارا نام بیچاری قضا کا ہوگیا

اُٹھا دیا جو خراباتیوں نے محفل سے — خدا نخواستہ میں تارکِ شراب نہ تھا

طلب کرتی ہے اُس کی ہر ادا دل — کہاں سے لاؤں اتنے یا خدا دل

بانکپن تیرا کسی اور ستمگر میں نہیں — تجھ میں جو نوک ہے قاتل ترے خنجر میں نہیں

نہ آہ مجھ سے نہ نالے ہی ساز کرتے ہیں — وہ ننگِ عشق ہوں سب احتراز کرتے ہیں

مجھکو جس دل کی شکایت تھی کہ قابو میں نہیں — اب تڑپتا ہوں اکیلا وہ بھی پہلو میں نہیں

عشق کی چوٹ کا کچھ دل میں اثر ہو تو سہی — درد کم ہو کہ زیادہ ہو مگر ہو تو سہی
یا ہمیں کھینچ بلائیں گے انہیں یا وہ ہمیں — کششِ عشق ادھر خواہ اُدھر ہو تو سہی
کیوں ٹھنک وصل کی شب بھی نہ ہنسیں یار ستم — شام سے ہے یہی دھمکی کہ سحر ہو تو سہی
آئے ہیں وہ کہ رلا کر مجھے پونچھیں مرے اشک — آنکھ کمبخت مگر خشک ہے تر ہو تو سہی

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو — فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

لو تاک کئے لیتے ہیں ہم دیدۂ مشتاق — اب دیکھیں تو آجاتے ہو تم دل میں کدھر سے

ایسی کچھ میرے تصور نے دکھائیں شوخیاں — خود لپٹ آغوش میں کھینچا تری تصویر نے

کرشمے تم نے خدائی کے سب دکھائے بتو — بس ایک بندہ نوازی کی شان باقی ہے

محبت دیتی ہے جو درد عاشق کو وہ روز افزوں　　جگر میں پھانس چبھتی ہے تو بڑھکر تیر ہوتی ہے

دائی وصل کے خواہاں نہیں ہم تجھ سے فلک　　چار دن وہ بھی بہت جلد گذرنے والے

ملو نہ تم تو یہی لطف گاہ گاہ ملے　　کہ ہم سے آنکھ ملے، دل ملے، نگاہ ملے

پکار اٹھنے سے دعوے عشق کا ثابت نہیں ہوتا　　مری اک چپ ہے بڑھکر سو گواہوں کی گواہی سے

مری آنکھیں تری صورت کو ترسیں　　گلہ ہے مجھکو صورت آفریں سے
مرا خط دے کے کہنا اُن سے قاصد　　کہ پڑھ لو اس کو تم کچھ تو کہیں سے

دل سے اُلفت میں بہت حسرت و اراں نکلے　　اور جو رہ گئے وہ جان کے خواہاں نکلے

تڑپنے دو مجھے یا امتحانِ صبر ہی لو　　کہ ایک شخص سے بس ایک کام ہوتا ہے

وہ توبہ جس کے ہاتھوں سیکڑوں جام و سبو پھوٹے　　ابھی تو ٹوٹ جاتی ہے کہیں مے کی جو بو پھوٹے

شروع عشق ہی میں ہیں دل و جگر بیتاب　　ابھی سے حال یہ ہے اپنے ساتھ والوں کا

ہم تھوڑے سے جرم پہ بھی شرمائے ہیں کیا کیا　　اک جرعہ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا

نالۂ وبیل درد میں حاصل بیاں سے کیا　　دل تو پکارتا ہے کہوں میں زباں سے کیا

نشان بخت سے پوچھا جو خوش نصیبوں کا　　تو اُس نے نام بتایا مجھے رقیبوں کا

جلاؔل عہد جوانی ہے دو گے دل سو بار　　ابھی کی توبہ نہیں اعتبار کے قابل

کس سے درد اپنا کہیں کون ہے غمخوار دنیں　　ایک دل وہ بھی اُنہیں کے ہے طرفدار دنیں

تم سے خوش چشم تو دیکھے نہیں انسانوں میں　　پُتلیاں ہیں کہ پریزاد پری خانوں میں

بزم مے میں تماشے ہوتے ہیں　　جام ہنستے ہیں شیشے روتے ہیں

میلا ہے بس دفن جلال اپنی لحد پر
تابوت کے ساتھ آئے ہیں ارمان ہزاروں

کوئی یہ پوچھ دے دردِ نہاں سے
تجھے دل ڈھونڈھ لایا ہے کہاں سے

دیر میں بھی شغل سجدہ رائیگاں اوقات کی
کچھ خدا نے ہم کو پوچھا کچھ بتوں نے بات کی

شمع ہے ہر استخواں پوچھو نہ حالِ سوزِ غم
سوز بانیں ہیں مگر فرصت نہیں اک بات کی

نجات ہو گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے
اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے

ہمیں وہ نامہ بر لا جواب ملتا ہے
جسے وہاں سے پیمبر خطاب ملتا ہے

جب سینہ چاک چاک ہو دل بھی تپاں رہے
پھر آرزو کسی کی الٰہی کہاں رہے

دل کی کیا کیا شب فرقت میں مدارات نہ کی
لاکھ روٹھے کو منایا مگر اک بات نہ کی
شاد ہو ہو کے کہلاتا ہوں کلیجہ اپنا
غم بھی کیا یاد کرے گا کہ مدارات نہ کی
کوچۂ یار میں دل جا کے ہمیں بھول گیا
بے مروت نے کبھی آ کے ملاقات نہ کی
سنتے ہیں آئی تھی مستانہ گھٹا بستی پہ
خبر اس کی ہمیں یارانِ خرابات نہ کی

کاش خود ہی اسے منظور رُلانا ہو جائے
دل بھر آتا ہے رونے کے بہانا ہو جائے
دل تمہیں دینگے جب اس میں یہ صفت ہو لیگی
کبھی آئینہ بنا لو کبھی شانا ہو جائے

واہ ری تاثیر میری بے اثر فریاد کی
ہو گئے افلاک پتھر کے زمیں فولاد کی

تیوری جو اس کی چڑھ گئی عاشق پہ آ بنی
بن کر ادا بنی تو بگڑ کر قضا بنی

اک رات دل جلوں کو یہ عیش وصال دے
پھر چاہے آسمان جہنم میں ڈال دے
قاتل سے ہم جو روٹھ چلے یہ نہ ہو سکا
شمشیر ہاتھ دوڑ کے گردن میں ڈال دے

دل کو دیتے ہیں دعا روتے ہیں گردن ڈالے
جس مصیبت میں ہمیں چاہے یہ دشمن ڈالے
کیا کیا وفائیں کی ہیں ذرا یاد کیجئے
کچھ سوچ کر غلام کو آزاد کیجئے

غیر کرتا ہے جبین سائی قدم پر یار کے دیکھ لینا آج ماتھے جائینگی دو چار کے

غم دلدار جب آتا ہی دل خوش ہو کے کہتا ہی مرا سرمایۂ عیش و نشاط زندگی آیا

کہتی ہے قضا کشتہ ہیں اس کی ادا کا کیا سیر ہے لیتی ہے ادا نام قضا کا

اُس شوخ نے خلوت میں طلب مجھکو کیا ہی ٹل جائے جو دم بھر کو تو احسان حیا کا

دیکھو اچھا نہیں نظروں سے گرانا دل کا دونوں عالم میں رہیگا نہ ٹھکانا دل کا

بیخودی ہے وصل میں بہتر کہ خلوتخانہ ہی ہوش کو کیا دخل کیوں آتا ہی کچھ دیوانہ ہی

لاکھ یہ آسمان چھڑائے جلال چھوٹتا کب ہے لکھنؤ مجھ سے

جب اُسے لکھتے ہیں خط کھلتا ہے قسمت کا بگاڑ آپ ہی آپ وہ تحریر بگڑ جاتی ہے

غیر کو شانہ کش گیسوئے جاناں دیکھا رات کو ہم نے عجب خواب پریشاں دیکھا

پیش آئیے کبھی تو محبت کی راہ سے شکوے کرے نگاہ ہی ملکر نگاہ سے

یوہیں تقدیر دکھائے کبھی حسرت دل کی آپ سُنتے ہوں میں کرتا ہوں شکایت دلکی

وصل کے سب لطف شکوے کھو چکے ہم پشیماں آپ نادم ہو چکے

شب وصال یہ اندھیر کیا کیا میں نے کہ اس کو لیکے تہ آسمان نکل آیا

جلال داغ بھی اُس نے اگر دیئے ہم کو
فلک جلا یہ سمجھ کر کہ مہر و ماہ ملے

مرزا بہادر جگر ۵؎

مرزا محمد عباس علی خاں نام جگر تخلص خلف مرزا احمد آغا علیخاں ناظم صوبہ اودھ مرحوم رئیس لکھنؤ آپ کی ولادت سنہ ۱۸۵۰ء میں ہوئی سنہ ۱۸۷۵ء میں آپ ذاتی قابلیت اور اپنے موروثی حقوق کے سبب سے "سول سروس" کا امتحان پاس کرکے فیض آباد کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے مرزا صاحب کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی۔ پانچ برس کے بعد آپ کا تبادلہ ضلع ہردوئی کو ہوگیا۔ اور بضرورت انتظام خانگی چند سال کے بعد آپ نے سرکاری خدمات سے سبکدوشی حاصل کرکے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ مرزا صاحب نہایت نیک مزاج متین آدمی تھے۔ سرکاری ملازمت کے زمانے میں بھی آپ نے ہندوستانی وضع رکھی' انگریزی' فارسی' عربی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ اور سیاق وسباق میں ماہر تھے۔ شاعری کا شوق طبیعت میں ابتدائے سن شعور سے تھا باوجود اس کے شاعری کا دعوےٰ نہ تھا۔ حافظہ ایسا صحیح تھا کہ سیکڑوں شعر اُردو فارسی کے یاد تھے' شعر کے حسن وقبح پر بہت جلد نظر دوڑ جاتی تھی۔ انتہائے کتب بینی سے آخر عمر میں آپ کی بصارت کم ہوگئی تھی۔ مگر مذاق شاعری عروج پر تھا۔ دیوان مکمل ہوگیا تھا۔ مرض حبس البول میں مبتلا تھے۔ ایک مرتبہ ایسے سخت بیمار ہوئے اور مرض نے ایسی طوالت کھینچی کہ کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ پندرہ بیس روز تک اشتداد مرض میں مبتلا رہے۔ دو مرتبہ نشتر لگایا گیا۔ آخر ۱۳۔ مئی سنہ ۱۹۱۰ء کی نصف شب کو انتقال فرمایا۔ اور موافق وصیت کے لاش کربلائے معلی بھیجی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کی ذات رؤسائے لکھنؤ میں بہت مغتنم تھی۔ آپ کی فیاضیاں زباں زد عام ہیں اور آپ کے خاندان میں فیاضیاں موجود ہیں۔

انتخاب کلام

نہ مسرت ہیں ابھی نہ ملال اچھا ہے — آپ راضی رہیں ہمیں وہی حال اچھا ہے
ہمنشیں وہ اگر آتے ہیں تو آنے دینا — یہ نہ کہنا کہیں اللہ کہ حال اچھا ہے

۵؎ یہ موروثی خطاب ہے۔ مولف

آپ کو حضرت زاہد ہے عبث رنجِ شباب
آپ کے حق میں جوانی کا زوال اچھا ہو

غیر کے کہنے پہ اچھا نہ سمجھنا مجھ کو
تم چلے آؤ تو بیشک مرا حال اچھا ہو

مانگ جو مانگنا ہے خالقِ اکبر سے جگر
سارے عالم میں اسی سے تو سوال اچھا ہو

نتیجہ زندگانی کا ہے کچھ دنیا میں کر جانا
خیالِ موت بیجا ہے وہ جب آئے تو مر جانا

کریں ہم آہ کس دل سے نزاکت منع کرتی ہے
کن آنکھوں سے بھلا دیکھیں کسی کا منہ اتر جانا

عیادت کو وہ کیا آتے ہیں گویا دل جلاتے ہیں
نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا ادھر آنا ادھر جانا

مرے قاتل کو اب کی بار یہ ہم کو جتانا ہے
ضرورت تو نہیں لیکن ذرا تم بھی سنور جانا

بڑی مشکل سے اتنا قرب تجھ سے آج حاصل ہے
ہمارے بیچ میں ظالم کہیں جلدی نہ کر جانا

کہیں کیونکر بتاؤ تو دکھائیں حال دل کس کو
وہ اتنی دور ہیں ہم سے کہ مشکل ہے نظر جانا

یاد آتا ہے مجھے جب تو ہنسی آتی ہے
دیکھ کر آئینہ اس شوخ کا حیراں ہونا

لٹی جاتی ہے مری روح لطافت میری
ہاتھ کا ان کے جو مرقد پہ نشاں دیکھا ہے

چشمِ حیرت سے فلک دیکھ رہا ہے تم کو
یہ نیا طرزِ ستم اس نے کہاں دیکھا ہے

کہہ دو تمہیں کہ لائقِ تیرِ نظر ہے کون
مدت سے یہ کشمکش مرے قلب و جگر میں ہے

سب جانتا ہوں میں مجھے غافل نہ جانئے
ہر ایک بات آپ کی میری نظر میں ہے

احباب باوفا نے تو چھوڑا ہمارا ساتھ
اپنا بھی کوچ اب یہی شام و سحر میں ہے

کٹتے ہیں اپنے ہاتھ سے کاٹو تم اپنا سر
گویا کہ اُن کی تیغ ہماری کمر میں ہے

کب تک اٹھائیں آپ کی نازک مزاجیاں
طاقت نہ دل میں ہے نہ ہمارے جگر میں ہے

عام حالت پہ بسر کی زندگی تو نے تو کیا — کچھ تو کر ایسا کہ عالم بھر میں افسانہ رہے

اب رنگِ زمانے نے وہ بدلا ہے کہ جس میں — سائل کے لئے دستِ تونگر نہ اٹھے

زمانہ دولتِ دنیا اُنہیں کو دیتا ہے — کہ جن کا نام بھی وقتِ سحر نہیں لیتے

ساری دنیا ہے تری سارا زمانہ تیرا — جس کو سنتا ہوں وہ کہتا ہے فسانا تیرا
جس ستم کی تھی نہ امید وہی تو نے کیا — نزع کا حال مرا اور نہ آنا تیرا

دل توڑ توڑ کر مر سکتے ہیں بار بار — جیسا تھا اُس سے ہم اسے بہتر بنائینگے
اغیار کیا ہنسیں گے ترے حال پہ جگر — جو خود بنے ہیں وہ تجھے کیوں کر بنائینگے

لو خدا حافظ وہاں جاتے ہیں اب — جس جگہ جا کر کوئی آتا نہیں

سحر بھی ہو گئی دن بھی چڑھ آیا — جگر اٹھے نہیں یہ بات کیا ہے

دامن بچا کے خون سے کر قتل بے وفا — دھبا اگر لگا تو چھڑایا نہ جائے گا
بالیں پہ ہے وہ رشکِ قمر دیکھ اے جگر — پھر آئے گا وہ وقت کہ دیکھا نہ جائے گا

وصل پر اس کے کمال جو اشارا ہو جائے — تیرے بیمار کو جینے کا سہارا ہو جائے

اُن کا ملنا اک خیالِ خام ہے — کیوں تڑپتا اے دلِ ناکام ہے
بس جگر اب زندگانی ختم ہے — اُن کی اُلفت موت کا پیغام ہے

جناب رشید لکھنوی

سید محمد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید مرثیہ گو سید احمد مرزا صاحب صابر مرحوم کے صاحبزادے ہیں بچپن سے لوگ آپ کو پیارے صاحب پیارے صاحب کہتے تھے۔ آخر وہی نام ہو گیا

صابر مرحوم کی شاعری نے تو اس قدر شہرت نہیں حاصل کی لیکن رشید کے عم بزرگ سید حسین مرزا صاحب عشق نامی مرثیہ گو تھے۔ وقعت فن کے لحاظ سے ابتدائی تعلیم کے بعد رشید صاحب نے انہیں کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کے دوسرے چچا سید مرزا صاحب تعشق بھی اچھے شاعر تھے اور تغزل کا رنگ ان کے کلام میں اچھا تھا۔ رشید صاحب نے دو استادوں کی نگرانی میں فن شاعری حاصل کیا۔

ان کے والد سید احمد مرزا صاحب صابر میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کے خویش تھے اس لحاظ سے جناب رشید کو اپنے نانا کے رنگ شاعری پر ناز تھا۔ مگر تعلیم کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ جناب رشید کی مرثیہ گوئی نے آخر عشق کی شاعری کا رنگ اختیار کیا۔ عشق اور انیس کی شاعری میں وہی فرق ہے جو انیس و دبیر کی شاعری میں ہے عشق مرحوم کی شاعری میں تحقیق الفاظ اور صحت روایات کا بہت خیال ہے۔ لیکن کسی قدر روکھا پھیکا پن ہے اسی وجہ سے ان کے کلام نے اتنی شہرت نہیں حاصل کی۔ جناب رشید تعلیم فارسی سے فارغ ہوتے ہی شاعری کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کا رنگ تغزل بہت اچھا تھا۔ اکثر مشاعروں اور امرا کے مشاعروں میں بھی آپ شریک ہوا کئے ہیں۔

عشق و تعشق کے بعد رشید کی شاعری نے شہرت حاصل کی۔ غزل کی مشق بہت چڑھی ہوئی تھی۔ اسی لئے جب آپ نے مرثیہ گوئی میں قدم رکھا تو اس میں بھی غزل کا رنگ غالب رہا۔ رفتہ رفتہ آپ مرثیہ میں بہاریہ مضمون لکھنے لگے اور یہ روش آپ کی سب کو پسند آئی۔

جناب رشید کے مرثیے میں ساقی نامے کا رنگ بہت چوکھا رہتا ہے جس میں آپ نے ظہوری کا رنگ اختیار کیا ہے۔ ابتدا میں آپ مرثیے بہت مشقت سے کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ

حیدرآباد میں نواب بہرام الدولہ بہادر کے کانوں تک آپ کی مرثیہ گوئی کی خبر پہنچی تو انھوں نے اپنی مجالس کے لیے انہیں کو تجویز کیا۔ نواب بہرام الدولہ کے یہاں اکیس محرم سے تیس محرم تک مجلسیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں جن میں اکثر حضور نظام حیدرآباد بھی رونق افروز ہوتے ہیں نواب بہرام الدولہ جناب رشید کی بہت عزت کرتے ہیں اور بعد اختتام مجلس ایک ہزار پانچسو روپیے بھی نذر کرتے ہیں۔

پہلی ربیع الاول سے آٹھویں ربیع الاول تک آپ کلکتے میں سفیر ایران کے یہاں مجلسیں پڑھتے ہیں۔

لکھنؤ میں آتوجی کی مسجد میں ایک مرثیہ پڑھتے ہیں جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے ہیں اور لطف شاعری آتا ہے تخمیناً دس بارہ برس سے آپ مجلس خوانی کرتے ہیں۔

مرثیے کی بعض بیتیں اور بعض بند آپ نے ایسے لکھے ہیں جو لوگوں کی زبانوں پر رہ گئے ہیں۔ سلام کے بعض شعر، رباعیاں پیری کی حالت میں ایسی لکھی ہیں جن کی اساتذہ حال نے داد دی ہے۔

ایک سلام کا شعر ہے جس میں پیری کی حالت کو نئے عنوان سے دکھایا ہے۔

غرور اب کیا بڑھیگا خم ہوئے تا سر جو پیری سے
ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھکرا کے ہیں

ایک غزل پر سلام لکھا ہے۔

کیا ہے کے خاک تربت سرور بنائینگے — دل اور ایک دل کے برابر بنائینگے
کرتے ہیں جمع اشک ہمارے ملائکہ — حوروں کے کان کیلئے گوہر بنائینگے
اعدا روتے جاتے ہیں لوہا کیا ہے نرم — قتل حسین کے لیے خنجر بنائینگے
شہ دامن رضائے خدا کو یہ دیں گے طول — اپنا کفن مزار کی چادر بنائینگے
ٹوٹے ہیں دل غریبوں کے باقی نہیں ملا — یہ جام پھینک کر لب کوثر بنائینگے
کرکے حسن کو خلق ہوا حکم کردگار — اک غنچہ خاندان پیمبر بنائینگے
ہو جائے غرق کشتی امت محال کیا — شبیر اپنے صبر کو لنگر بنائینگے
کہتی تھی ذوالفقار نہ تھی مجھکو یہ خبر — شبیر مجھ سے تربت اصغر بنائینگے
مضمون نکال جاؤ ہزاروں تم اے رشید — گلدستے ان گلوں کے سخنور بنائینگے

شاہی میں رشید کی عمر دس برس کی ہوگی اور اس وقت آپ کا سن پینسٹھ برس کا ہے۔ آپ بدن کے دُبلے اور نہایت ضعیف الجثہ ہیں۔ فرماتے ہیں "اس قدر ضعیف ہوں اکثر چلنے میں گر گر پڑتا ہوں"

تواضع اور انکساری میں آپ کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہی شاعرانہ مبالغے کا پہلو لئے ہوئے۔ آپ کی بات بات سے شاعری ٹپکتی ہے۔

یہ تو آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "سب اچھے ہیں میں برا ہوں" لیکن اس کو کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آپ کے انکسار کا ایک خاص رنگ ہے جس میں شاعری کا ایک جزو ملا ہوا ہے۔

بہرحال لکھنؤ کا رنگ تصنع ابھی تک زندہ ہے اور مشرقی تہذیب کے لوگ اس کو برتنے پر مجبور ہیں۔ لباس اور پوشاک میں بھی خاص امتیاز رہتا ہے۔ بات چیت میں تکلف۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس مٹنے پر بھی لکھنؤ کی خلقت غنیمت ہے۔

انتخاب کلام

رباعیات

پیری میں خمیدہ کر دیا ہے تو نے ظالم کیسا ستم کیا ہے تو نے
سیدھا ہونے دے اپنو لے پیرِ فلک اپنا سا مجھے بنا لیا ہے تو نے

کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں
پیری تو جوانی سے گرانقدر نہیں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں

پیری نے جھکایا ہے سفر کرتا ہوں سب اہل زمیں کو یہ خبر کرتا ہوں
عالم کو جو خوب دیکھنا ہے منظور ذرّے ذرّے پہ میں نظر کرتا ہوں

ہے ضعف کہ دشوار تکلم ہے اب مینا اک برق کا تبسم ہے اب

پیہم دیتی ہے فوجِ پیری جو شکست　　دانتوں کی صفوں میں بھی تلاطم ہے اب

دوں گا میں دعا چین اگر پاؤں گا　　کچھ دن ابھی دنیا کی ہوا کھاؤں گا
اتنا نہ جھکا کہ گر پڑوں اے پیری　　اب چھوڑ مجھے، خاک میں مل جاؤں گا

وہ تیز زباں وہ خوش بیانی نہ رہی　　کیفیتِ باغِ زندگانی نہ رہی
دیکھا بھی نہ ہم نے خوابِ غفلت میں تجھے　　اب آنکھ کھلی کہ جب جوانی نہ رہی

افسوس اُمیدِ زندگانی بھی نہیں　　طفلی نہیں، پیری و جوانی بھی نہیں
رخصت ہوئی روح ساتھ چھوڑا سب نے　　وہ وقت آیا کہ ناتوانی بھی نہیں

طفلی میں جو تھا وہ دل ہمارا نہ رہا　　بعد اس کے شباب کا سہارا نہ رہا
فصلِ پیری میں دانت سب ٹوٹ گئے　　آئی جو سحر تو کوئی تارا نہ رہا

سُن لیجیے شباب کی کہانی مجھ سے　　کچھ اس کی ہوئی نہ قدردانی مجھ سے
میں پیر ہوا سخن ہوا میرا جواں　　لی میرے کمال نے جوانی مجھ سے

اب تو ہے تلاشِ یارِ جانی مجھ کو　　ہے یاد اب تک وہ مہربانی مجھ کو
میں تو طفلی سے کھیلتا پھرتا تھا　　اور ڈھونڈتی پھرتی تھی جوانی مجھ کو

ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ راتیں ہیں　　سمجھوں کا مرے پاس بھی سوغاتیں ہیں
تربتیں گنہ سارے بیاں کر کے رشید　　کہہ دوں کا جوانی کی یہ سب باتیں ہیں

بالوں کی سیاہی، آہ ہیہات گئی　　کہتے ہیں جوانی جسے، وہ رات گئی
پیری نے زبان کی فصاحت کھو دی　　لو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی

مدّت سے جدائی کا الم باقی ہے — اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہے
یوں جھک کے جوانی سے ملا وقتِ وداع — جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہے

سو رنج میں روز کم سے کم کھاتا ہوں — جو کوئی نہ کھا سکے، وہ غم کھاتا ہوں
پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم — جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

کیوں کنجِ لحد کے متصل جاؤں گا — کہنے کے لئے مطلبِ دل جاؤں گا
پیری سے بنوں گا منکسر اور رشید — جھکتے جھکتے زمین سے مل جاؤں گا

پیری سے رہا نہ کوئی چارا ہم کو — قوت کا قوا کے تھا سہارا ہم کو
تنہا موت آکے کیا بنا لیتی رشید — پیری نے شریک ہو کے مارا ہم کو

پیری سے ہوئے ہیں سفری کی صورت — اٹھتے ہیں تو دردِ جگری کی صورت
ہم بیٹھتے ہیں غبارِ خاطر کی طرح — چلتے ہیں نسیم سحری کی صورت

کب کوئی بلا نگاہ بانی سے رکی — اک لحظہ نہ موت زندگانی سے رکی
پیری کا نام گو ضعیفی ہے رشید — پر ایسی قوی ہے نہ جوانی سے رکی

اس دہر سے سب بُرے بھلے جائینگے — کیا خلق سے جز گناہ لے جائینگے
پیری سے ہیں خم حشر میں دیکھیگا کون — جنّت میں جھکے جھکے چلے جائینگے

ہر چند بہت ملول و دلگیر ہوں میں — کیا فائدہ کیوں بیاں کروں پیر ہوں میں
دیکھو مجھے، پوچھنے سے حاصل کیا ہے — پیری وہ ہے جس کی تصویر ہوں میں

پیری سے ہیں خم راہِ جناں کیونکر لیں — اک عمر پھرے ہیں، دم ذرا، دم بھر لیں

سوئے ہیں لحد میں لے فرشتو نہ اٹھاؤ
چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں

افسوس جوانی کی نہ کچھ غور ہوئی
ہوتی تھی جو کیفیت بہر طور ہوئی
دانتوں نے کیا قصد جدا ہونے کا
آنکھوں کی مجھ سے نظر اور ہوئی

دل کو طرفِ عجز موصوف کیا
ایسا سوئے انکسار مصروف کیا
اپنا بھی مقابلہ نہیں کرتا میں
اب آئینہ دیکھنا بھی موقوف کیا

پیری میں رشید یہ بدآئینی ہے
بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے
آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ
اب تک تمہیں خیال خود بینی ہے

انتخاب غزلیات

شبہ ہے تم کو کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو
کیں وہ بعد وصل باتیں بڑھ گیا پھر شوق وصل
ہیں وہی نکلے تھے جو ارمان سارے رات کو
دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو
آپ نے پوچھا نہ جان و دل جگر نے لی خبر
درد فرقت میں نہ کس کس کو پکارے رات کو
آپ آرائش بھی کرتے ہیں موافق وقت کے
دن کو منہ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دلکو صبح سے آج اے رشید
دل ربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

لے لیا کل شب کو چٹکی میں کئی بار آپ نے
شمع میں ہوتا تو کرتا پیار اس گل گیر کو
دست و پا میں ہے تشنج آتی ہیں انگڑائیاں
آج میں نے کھینچتے دیکھا ہے تری تصویر کو
دیکھنے کو ہے فقط تصویر کی صورت رشید
سچ اگر پوچھو جوانی لے گئی اس پیر کو

مار ڈالے گی مجھے یہ خوش بیانی آپ کی
موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

آپ سے ملکر گلے راحت سے آجاتی ہے نیند
سبزۂ خوابیدہ ہے پوشاک دھانی آپ کی

بعد مُردن کھینچ لایا جاذبِ دل سینے پہ ہاتھ
ایک انگوٹھی میں جو پہنے تھا نشانی آپ کی

بڑھ کے جھکا قد بھی، عروجِ حسن کی حد ہو چکی
اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپ کی

مجھ سے دن بھر دل کہا کرتا ہے قصہ آپ کا
رات بھر میں دل سے کہتا ہوں کہانی آپ کی

جب وہ مجھکو دیکھتا ہے ہنس کے کہتا ہے رشید
کتنی پابندِ وفا ہے زندگانی آپ کی

سزا ہر ایک کو دینے لگی حیا اُن کی
کہ چاک ہو گئی لپٹی جہاں قبا اُن کی

بہت غرور ہے عادت نہیں تواضع کی
جھکائے دیتی ہے لیکن اُنھیں حیا اُن کی

شکایتیں بھی گئیں جب سے زخم پھیل گئے
زیادہ ہو گئی ہے میرے دل میں ہوا اُن کی

وہ مستِ ناز تھے دو گام بھی نہ چل سکتے
سنبھالتی ہوئی لائی اُنہیں ادا اُن کی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے
کہ جابجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

کیوں نہ رنگِ ماہ فق ہو سامنے آتے ہوئے
تیرے آگے مہر کو دیکھا ہے تھراتے ہوئے

اپنی اپنی جا ہر اک مغرور ہے اے شاہِ حسن
لاکھ بل کھاتے ہیں گیسو تا کمر آتے ہوئے

فتنۂ محشر صدا دیتا ہے جب چلتے ہیں آپ
ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

کھنچکے دم آیا لبوں تک روح گھبرانے لگی
سچ بتاؤ کیا اشارہ کر گئے جاتے ہوئے

زلفِ سنبل نے سنواری ہو یہ کس نے کہدیا
آئے غصے میں چمن تک بال الجھاتے ہوئے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہیں نئی تدبیر سے
طوقِ منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے

ذبح میں بھی لی گئیں ہم پر بہت سی تہمتیں
سیکڑوں طوفاں اُٹھے آبِ دمِ شمشیر سے

کشتۂ لاغر کو اپنے دفن کر دیجے فقط
غسلِ میت ہو چکا آبِ دمِ شمشیر سے

آپ سے جائیں انہیں یا دل کے ٹکڑے جوڑ دیں
میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

نزع میں ہیں پاؤں میرے کوئے جاناں کیطرف
چاہتا ہوں واں پہنچ جاؤں کسی تدبیر سے

کلمۂ حق اب تو لازم ہے بُتِ بے پیر سے
رکھ چکا ہے حلق پر خنجر دمِ تکبیر ہے

آپ کی آنکھوں نے مارا دل کی یہ تقریر ہے
اُس کے دعوے پر گواہی مرنے کی تحریر ہے

وہ اسیرِ حُسن ہیں اور ہم اسیرِ عشق ہیں
واں گلے میں طوق ہے یاں پاؤں میں زنجیر ہے

ایک ظالم نے کسی کو آج زخمی کر دیا
یہ نہیں معلوم کس کا دل ہے کس کا تیر ہے

اثر ہے دل کا ہر اشکِ رواں میں
نشاں یوسف کا ہے سب کارواں میں

غرورِ عشق سے یہ تفرقہ ہے
چمن میں گل ہیں بلبل آشیاں میں

خبر رکھنا ذرا اے ساتھ والو
کہ ہم ہیں پا شکستہ کارواں میں

نزع میں رشکِ مسیحا کا خیال اچھا ہے
گو بُرا وقت ہے لیکن مرا حال اچھا ہے

تیرے بیمار تک آنے نہیں پاتا کوئی
بیکسی دور سے کہدیتی ہے حال اچھا ہے

میں نے کچھ سوچ کے یہ نزع میں کہلا بھیجا
اب مری جان نہ آنا مرا حال اچھا ہے

اے جنوں خواہش ہے میرے پاؤں کو زنجیر کی
بیڑیاں بڑھتی ہیں شاید اُس بُتِ بے پیر کی

پھر جب ہوگا یہ باتیں یاد آئیں گی ہمیں
خون رُلوائے گی رنگینی تری تقریر کی

خوب ہمسایہ بغل پھیلے ہوئے ہیں زخم و درد
دل کی بستی میں دُہائی ہے تمہارے تیر کی

جبر ہے اب خاطرِ احباب کب تک اے رشید
فکر اندا دیتی ہے طاقت نہیں تحریر کی

جلوہ گر بام پہ جب مہرِ رُخِ یار نہ تھا
کوئی کوچے میں بجز سایۂ دیوار نہ تھا

بس مرادِ رہائی کا ہے غم دلہائے نالاں پر
وفاداروں کی روحیں روتی ہیں دروازۂ زنداں پر

ہجومِ ناتوانی ہے۔ جنوں کی فصل آ پہنچی
مجھے آتا ہے رونا حسرتِ دست و گریباں پر

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا
نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر

نشاں خوں ریزوں کا دے رہے ہیں سرخ لب تیرے
شہید و کشتے ہیں لاشے سرِ حدِ شہرِ خموشاں پر

عقدے الفت کے سب اے رشکِ قمر کھولدیئے
سینہ یوں چاک کیا داغِ جگر کھولدیئے

سب حسینوں نے مرے قتل پہ کمریں باندھیں
ڈورے تلواروں کے اور بندِ سپر کھولدیئے

آگیا ہوش تری چال کے مشتاقوں کو
حشر کی سن کے صدا دیدۂ تر کھولدیئے

عامِ باراں کی طرح سے ہے کرم ساقی کا
آئی برسات کے کہ میخانے کے در کھولدیئے

جا عجب کی نہیں گر اہلِ محبت روئے
میرے ماتم میں حسینوں نے بھی سر کھولدیئے

امتحاں حسرتِ پرواز کا منظور ہوا
ذبح کرکے مجھے صیاد نے پر کھولدیئے

شرم آئیگی مجھے لوگ سمجھ جائیں گے
تم نے گیسو مرے لاشے پہ اگر کھولدیئے

رشید آغازِ الفت سے کہیں انجام بہتر ہے
کہ بحرِ عشق کے ڈوبے لبِ کوثر نکلتے ہیں

سحر تک روزنِ زنداں کی ہلا کرتی ہیں دیواریں
نہ جانے تیرے قیدی کس طرح فریاد کرتے ہیں

اور بگڑے ہیں مزاج آپ کے دیوانوں کے
آج در بند کئے جاتے ہیں زندانوں کے

وصلتِ شمع کی شب بھر تو رہی سر میں ہوا
صبح کو بزم میں پر اُڑتے تھے پروانوں کے

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

قہر کی آج چلی تیغ نگاہِ ساقی
چور شیشے ہوئے ٹکڑے ہوئے پیمانوں کے

لختِ دل خونِ جگر نذرِ غم و درد کروں
ماحضر چاہیئے کچھ واسطے مہمانوں کے

ابر اٹھا یہ خبر پائی ہے مے خواروں نے
راستے بند نظر آتے ہیں مے خانوں کے

شاعروں کے لئے توہین کا باعث ہو رشید
تم نہ بیٹھا کرو مجمع میں سخندانوں کے

ساقیا دور رقیبوں کا رہا جام چلے
یاد رکھنا کہ ہم اس بزم سے ناکام چلے

مجھ تک آنے نہیں دیتے انہیں یہ کہکے رقیب
مہندی چھٹ جائیگی پاؤں کی جو دو گام چلے

بامِ گردوں سے گرا مہر اُدھر مغرب میں
سیر کرنے کو اِدھر تم جو سرِ شام چلے

ضعف ہو لاکھ گر دشت نوردی نہ چھٹے
حشر تک چاہیئے مجنوں کی طرح نام چلے

بے وفا کہہ کے پکارا دمِ آخر تم نے
وائے تقدیر کہ ہم لے کے یہ الزام چلے

سفرِ ملکِ عدم پر ہیں رشید آمادہ
بسکہ اب دیر نہیں صبح چلے شام چلے

حضرت ریاض

ہندوستان میں کون ایسا شخص ہے جو حضرتِ ریاض کو نہ جانتا ہو۔ ریاض الاخبار آج عمدہ لٹریچر میں انہیں کے زورِ قلم سے ایک ممتاز اخبار ہے۔ ریاض کی شوخ طبیعت اور جلبلی تخیل ابتدائے شاعری سے اپنی چمک دمک دکھا رہی تھی۔ آپ کا نام منشی سید ریاض احمد اور تخلص ریاض ہے۔ آپ کے والد مولوی سید طفیل احمد صاحب بڑے پائے کے عالم تھے۔ مولد کے اعتبار سے آپ خیرآبادی ہیں۔ خیرآباد ممالک متحدہ میں ایک ممتاز قصبہ ہے جس کی خاک سے مشاہیر علما اور فقیہہ پیدا ہوئے۔ لیکن آپ کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ ابھی خیرآباد کے مدرسۂ عربیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ یکایک طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی۔ عنفوانِ شباب تھا۔ اُس زمانے میں اسیر مرحوم کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ آپ اسیر کے شاگرد ہوئے۔ اور اُستاد سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ میں آئے۔ چند روز کے بعد خیرآباد سے ایک ماہوار رسالہ (گلکدۂ ریاض) نکالا۔ اسیر مغفور کی توجہ سے اس ماہوار گلدستے نے بہت ترقی کی۔ اُردو زبان کا یہ پہلا گلدستہ تھا جس کو تمام شاعر پسند کرتے تھے ریاض کی ابتدائی شاعری سب کو پسند آئی۔ اور آپ کو اپنی خدا داد طبیعت کی جہت کچھ داد ملی۔

اس کے بعد ریاض الاخبار خیرآباد سے جاری کیا جس کی تاریخ اشاعت "لمعۂ رخشاں" ۱۲۹۱ھ ہے شاعری کے شوق اور طبیعت کی مناسبت سے آپ خیرآباد سے اپنا دفتر لکھنؤ اُٹھا لائے بہت دنوں ریاض الاخبار لکھنؤ سے جاری رہا۔

ریاض کو ہمیشہ لکھنؤ میں قیام کرنے کا شوق رہا اور وہ اُس وقت اور موقع کی تلاش میں تھے کہ کوئی صورت لکھنؤ میں قیام کی نکل آئے۔ مگر افسوس لکھنؤ میں آپ کے مصارف اخبار سے نہ نکل سکے اور آخر آپ کو اپنا دفتر گورکھپور منتقل کرنا پڑا۔

گورکھپور میں ریاض الاخبار نے (حکام اور رؤسا کی علمی قدردانی سے) بہت ترقی کی۔ ادھر گورنمنٹی ملازمت کا سلسلہ نکل آیا۔ اور منشی ریاض احمد صاحب پیشکار سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے۔

ریاض الاخبار گورنمنٹ اور ملکی خیر خواہی کی بدولت ترقی کرنے لگا "گلکدۂ ریاض" کی اشاعت کے بعد حضرت خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروائے ریاست رامپور کو توجہ ہوئی۔

اس زمانہ میں آپ کی قدر افزائیوں کی شہرت عالمگیر تھی اور دربار رام پور میں منیر عروج۔ بحر۔ آغا حجو شرف۔ قلق۔ امیر۔ داغ۔ جلال وغیرہ مشاہیر فن جمع تھے حضور نے محض قدر دانی سے حضرت ریاض کو طلب فرما کر خلعت اور زر نقد سے ممتاز فرمایا۔ مگر افسوس ہے آپ قیام نہ فرما سکے۔

حضرت ریاض کی عمر کا زیادہ حصہ تعلقات کی بنا پر گورکھپور میں گذرا۔

ریاض الاخبار کی شہرت کے زمانے میں آپ نے ایک چھوٹا سا رسالہ نظم و نثر کا "فتنہ اور عطر فتنہ" کے نام سے ہفتہ وار جاری کیا۔

ریاض نے اپنی ذاتی قابلیت اور جوہر شناسوں کی قدر دانی سے نہایت خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ شرافت کے اعتبار سے بھی ریاض کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ سادات کرمانی سے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ شجاع والی کرمان اپنے وطن سے خیر آباد تشریف لائے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ معزز اور موقر رہا۔

ریاض اپنی زندگی کے پچاس سال گورکھپور کی نذر کر چکے تو آپ کے دل میں لکھنؤ کی محبت نے گدگدی کی۔ گورکھپور سے لکھنؤ آنے میں آپ کا بہت کچھ مالی نقصان ہوا لیکن ان سب کو آپ نے گوارا کیا۔ چنانچہ ایک مقطع میں آپ فرماتے ہیں:۔

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

ریاض خلیق۔ ملنسار اور متواضع آدمی ہیں۔ آپ کے بہت سے شاگرد اطراف ہند میں موجود ہیں مگر کبھی آپ نے اس بات پر فخر نہیں کیا۔

ریاض کے کلام میں شوخی کے علاوہ شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور عموماً کلام شاعری کے سقم سے بہت پاک ہے۔ زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو۔ ریاض کا خاص حصہ ہے۔

ریاض الاخبار ہمیشہ زبان کی خدمت کے لحاظ سے ممتاز رہا ہے جس زمانے میں منشی

امیر احمد کا پہلا دیوان چھپا ہے اور مولوی غلام محمد خاں تپش مرحوم اڈیٹر اخبار مشیر قیصر نے اعتراض کئے ہیں تو اس کے جواب جو منشی ریاض احمد نے اپنی قابلیت سے لکھے ہیں۔ وہ قابل دید ہیں۔

دوسرا معرکہ ریاض الاخبار میں امیر اللغات کے متعلق ہے مولوی غلام محمد تپش مرحوم کے اعتراضات اور منشی ریاض احمد کے معقول جوابات اور چلبلی چوٹیں بڑے مزے کی ہیں۔ آپ جہاں رہے۔ کچھ نہ کچھ زبان کی خدمت ضرور کرتے رہے۔

ابتدا میں ریاض کو مشاعروں میں شریک ہونے کا بہت شوق تھا اور کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں ریاض نہ ہوں۔ کوئی گلدستہ ایسا نہ تھا جس میں ریاض کی غزل نہ ہو پیام یار کی طرح ہے اور منشی نثار حسین کی فرمائش ہے۔ کہ گلدستہ لکھا ہوا رکھا ہے تمہاری غزل کا انتظار ہے۔ آپ نے قلم اٹھایا اور غزل موجود۔

لیکن اب مشاعروں میں جانا یک قلم موقوف اور غزل کا یہ حال ہے کہ اُن دوستوں سے تو مجبور ہیں جن سے بے تکلفی ہے۔ باقی سب سے عذر بارد۔

ریاض کا سن اس وقت پچاس برس کا ہے لیکن طبیعت جوان اور بذلہ سنج لطف یہ ہے کہ آپ کسی صحبت میں بار خاطر نہیں ہوتے جو آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔

انتخاب کلام

دورئ راہ سے کچھ بیٹھ گیا دل میرا ۔۔۔ پاؤں کیا خاک اُٹھے اب سوئے منزل میرا
رنگ باندھا ہے چمن میں یہ فغاں سے میری ۔۔۔ چپکے منہ دیکھتے رہتے ہیں عنادل میرا
آستیں رنگ یہ لے آئی لہو دے نکلی ۔۔۔ نہ چھپا لاکھ چھپا حشر میں قاتل میرا
بزم متوالی تھی کیا غم سے اڑا دی میں نے ۔۔۔ ہاتھ تھاما نہ کسی نے سر محفل میرا
کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک ۔۔۔ غم ترا جان مری رنج ترا دل میرا
یہ ہرا ہو کے رہا بعد فنا تربت میں ۔۔۔ جان سے بھی ہے سوا میرے لئے دل میرا

جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاض
جو کلی رہ گئی کھلنے سے بنی دل میرا

یہ کس کے سایۂ دیوار نے مجھے پیسا — یہ کون ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح
رہ حیات کٹی اس طرح کہ اُٹھ اُٹھ کر — میں بیٹھ بیٹھ گیا گردِ کارواں کی طرح
ہمیں ہے گھر سے تعلق اب اس قدر باقی — کبھی جو آئے تو دو دن کو میہماں کی طرح
گیا چمن میں تو جھک جھک کر بہت ملیں شاخیں — لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح
مجھے شباب نے مارا بلائے جاں بنکر — بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

ریاض موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

بہار نام کی ہے، کام کی بہار نہیں — کہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں
رہیگی یاد انہیں بھی مجھے بھی وصل کی رات — کہ اُن سا شوخ نہیں، مجھ سا بیقرار نہیں
جنابِ شیخ نے جب پی تو مُنہ بنا کے کہا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
یہی چراغِ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول — اب انکے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں

حنا لگا کے بیٹھتے ہیں گُل رخوں میں ریاض
کچھ اُن کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے — خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے
سنوارے جائینگے گیسو الٰہی بات بن جائے — دلِ صد چاک میرا ہے جو بنکر شانہ آتا ہے
ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ہزاروں حسن ہوتے ہیں — حنائی ہاتھ میں ساقی کے جب پیمانہ آتا ہے
گلے ملنے جھکی، جھک کر رکی، رک کر کبھی قاتل — تری شمشیر کو بھی نازِ معشوقانہ آتا ہے
مری تربت پر آکر شمع ہے کھوئی ہوئی کیسی — نہ اب گلگیر آتا ہے نہ اب پروانہ آتا ہے

ریاضِ خضر صورت جب سوئے میخانہ آتے ہیں
تو فوراً سر پہ ہر اک خم لئے پیمانہ آتا ہے

پھول ہے لالۂ صحرائی کا — یا کلیجہ ترے سودائی کا
شُل گیسو ہیں پریشاں شبِ وصل — تھا جنھیں شوق خود آرائی کا

بیٹھ کر چوری سے پینا پس خم راز ہے گوشۂ تنہائی کا
جائے بھی میرے سیہ خانے سے
شمع ہو کالا شب تنہائی کا

گھر میرے آئے آتے ہی دشمن کے گھر گئے آنا یہ خوب ہے اِدھر آئے اُدھر گئے
لیں اس طرح بلائیں ہماری نگاہ نے پہلے سے انکے اور بھی گیسو سنور گئے
موئے سیہ سفید ہوئے دیر اب نہیں وقت آگیا ہے شام گئے یا سحر گئے
تا میکدہ ریاض کا جانا محال تھا
کس طرح یہ بزرگ خمیدہ کمر گئے

وہ کچھ غیر سے وعدہ فرما رہے ہیں مرے سر کی سچی قسم کھا رہے ہیں
نہ اُفتاد کچھ پیش آئے الٰہی ذرا ہم چمن کی ہوا کھا رہے ہیں
دم وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں
کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں
عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں

نیند اے شب ہجراں نہیں آتی نہیں آتی آنکھوں میں جسے رکھتے تھے وہ بھی نہیں آتی
دینا ہے تو دے راہ خدا جام میں ساقی صدقے ترے چلو سے ہمیں پی نہیں آتی
روتے ہیں ہمیں دیکھ کے دشمن بھی ہمارے آتی ہے تباہی مگر ایسی نہیں آتی
کس درجہ مری روح کا باقی ہے تعلق
جب جاتی ہے میخانے سے پیاسی نہیں آتی

کچھ بگولوں سے بھرا خانۂ ویراں نکلا خاک ہو کر بھی یہ چھوٹا سا بیاباں نکلا
یہ وہ پتھر ہے جگہ سے جو کبھی ہٹ نہ سکا سنگِ در سے بھی سوا آپ کا درباں نکلا
رات بھر گو مرے ماتم میں رہا غیر کے گھر آستیں آپ کی مسکی نہ گریباں نکلا

منہ سے ٹپکائی تھی مینا سے کہ ہچکی آئی شیخ میخانے میں کچھ دیر کا مہماں نکلا

کبھی دبنے کے نہ تھے تنگ قبا سے فتنے
رعب تیرا ترے جوبن کا نگہبان نکلا

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی یہ شراب ارغوانی جائے گی
تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی اے حنا تو بھی تو سانی جائے گی
شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلیں گے وہ اب حیا کی پاسبانی جائے گی
موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا جان سے اچھی جوانی جائے گی
جان سے بڑھکر اسے رکھتے عزیز کیا سمجھتے تھے جوانی جائے گی
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی میکدے سے اب پرانی جائے گی

پینے آتے ہیں فرشتہ خو ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

تا شاخِ گل ہما را جب تک قفس نہ آئے باغوں میں ہم بہ گُل لاکھوں برس نہ آئے

گر گیا ہے مری آنکھوں سے مرا قطرۂ اشک آتے آتے سرِ دامن یہ گہر ٹوٹ نہ جائے

مئے سرخ ابرِ سیہ سبزۂ کہسار ریاض
یہ کوئی چیز نہیں توبہ اگر ٹوٹ نہ جائے

ہائے ری دیوانگی کوسا کیا تاثیر کو میں فغاں اپنی ہی سمجھا نالۂ زنجیر کو
مٹ چکی ان کی اداسی آچکی ان کو ہنسی میرے گھر آئے ہیں رونے غیر کی تقدیر کو

یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانہ میں ریاض
مانتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں میر کو

ہو جہاں شام مجھے ہے وہیں بستر میرا نہ ٹھکانا کہیں میرا نہ کہیں گھر میرا

لے چلوں میں طرفِ خلد انہیں کھینچ کے ہاتھ
وہ کہیں حشر کے دن یہ بھی مقدر میرا

پھیرتے ہیں بہت آہستہ گلے پر خنجر
ڈر یہ ہے ٹوٹ نہ جائے کہیں خنجر میرا

بات دل کی زبان پر آئی
آفت اب میری جان پر آئی

رو کے رکتا نہیں ہے سیلِ سرشک
اب تباہی مکان پر آئی

آئی بوتل بھی میکدے سے ریاض
جب گھٹا آسمان پر آئی

میرے سر پہ کبھی چڑھی ہی نہیں
میں نے کچے گھڑے کی پی ہی نہیں

ہائے سبزے میں وہ سبو بوتل
کبھی ایسی گھٹا اٹھی ہی نہیں

کس قدر ہے بنا ہوا زاہد
جیسے اس نے "وہ چیز" پی ہی نہیں

صبح کا جھٹ پٹا تھا، شام نہ تھی
وصل کی رات، رات تھی ہی نہیں

کون لیتا بلائیں پیکاں کی
آرزو دل میں کوئی تھی ہی نہیں

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو
اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

جنوں کھینچتا سوئے محشر جو مجھکو
مرے ساتھ میرا بیابان جاتا

وہ کافر حرم میں تھا ہم میکدے میں
جو کعبے میں ہوتے تو ایمان جاتا

ہر لختِ دل کی قبر بنے اُن کے نقشِ پا
مدفن جگہ جگہ دلِ مضطر کے ہو گئے

دامن پہ اب شباب کے وہ داغِ مے کہاں
جب بال تک سفید مرے سر کے ہو گئے

اتری جگر میں تیر کے ہمراہ وہ نگاہ
دو وار ایک ساتھ برابر کے ہو گئے

ان میکشوں میں سب سے ہم اچھے رہے ریاض
پی کر پیالہ ساقیِ کوثر کے ہو گئے

بزمِ ساقی ہو، مرا گھر ہو کہ میخانہ ہو جب اُڑانے کو ملے پھول تو جنت کیا ہے
آکے دو آنسو گرائے کوئی امید نہیں اب مری قبر سے لپٹی ہوئی حسرت کیا ہے

اے ریاضؔ آؤ بھی جاتے ہو کہاں زنداں سے
نہ کھلے گُل، نہ بہار آئی، یہ وحشت کیا ہے

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں یہی ہونگے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے
گرے غش کھاکے موسیٰ تو صدا یہ طور سے آئی کھلیں آنکھیں تری کچھ تو نے دیکھا، دیکھنے والے
سنو افسانۂ جم جام رکھکر سامنے ان کے ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

ہم نئے وضع نئے سر بات نئی رات نئی نئی صحبت میں حسینوں کو حجاب آتا ہے
مست بلبل کو جو دیکھا ہی کسی گُل کے قریب باغ میں جاتے ہوئے ان کو حجاب آتا ہے

یاد احباب کو آجاتے ہیں مرحوم ریاضؔ
میکدے سے جو کوئی مست شراب آتا ہے

کیسی ہیبت ناک کیسی تار و تیرہ بے چراغ میری تربت بھی بنی یارب مرے گھر کا جواب
ہنس رہی ہے طنز سے ساقی کی چینِ آستیں ہلکی موجیں بن رہی ہیں خطِ ساغر کا جواب

اپنے دیوانوں کو سمجھتا ہوں بڑی دولت ریاضؔ
ہے یہ مجموعہ مرا گنجینۂ زر کا جواب

چھری نہ تیز کریں آپ امتحان کے لئے بہت ہے نیم نگہ مجھ سے نیم جاں کیلئے
کسی کی چینِ جبیں پر مجھے ہنسی آئی
ذرا سی تیغ چلی میرے امتحاں کے لئے

آنکھ میں سحر نظر میں جادو لب میں اعجاز مسیحائی کا

تھوڑی پیتا ہوں بڑھاپے میں بھی

کہ سبب ہو یہ توانائی کا

نہیں ملتا کوئی مجکو شریک روز تنہائی یہ آفت ہے مرا سایہ بھی مجھسے دور رہتا ہے

ادب سے وعظ کی صحبت میں ہم وہ شے نہیں پیتے ہمارے جام میں افشردہ انگور رہتا ہے

لحد پر شمع سے بڑھکر ہے وہ دزدِ شمع کا جوبن وہ بنکر چور تو یہ بن کے زلف چور رہتا ہے

اثر بجلی کا ہے صیاد کیا تیری نگاہوں میں کہ ہر مرغ چمن پرواز سے مجبور رہتا ہے

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے وہ کافر بے پئے رات دن مخمور رہتا ہے

حسینوں کے حنا آلودہ ہاتھ اس سے کہیں اچھے کہ موقع پا کے بھی دستِ ادب معذور رہتا ہے

ترے صدقے ترے ہاتھوں سے اتنی پی ہو اے ساقی کہ اتنے بے پئے منہ پر ہمارے نور رہتا ہے

فرشتے پر سے مَس کرتے ہیں شاید اے ریاض اسکو

کہ اب ریشِ مبارک پر بہت ہی نور رہتا ہے

ہے ریاض ایک مردِ مست خرام نہ پئے اور جھومتا جائے

پیرو میر

شیخ محمد جان نام تخلص شاد مشہور بہ شاد پیر و میر باپ کا نام شیخ وارث علی۔ دادا شیخ فضل علی لکھنؤ کے قدیم شیخ زادے حضرت محمد بن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی نسل سے۔

اجداد مذہب حنفی سُنی رکھتے تھے مگر عہد شاہی میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ پیدائش کا سنہ صحیح تو نہیں ملا لیکن تخمیناً سنہ ۱۲۲۰ھ آپ کی ولادت کا سنہ ہے زمانہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ میں ایک چوبدار نے اپنے لڑکے کی شادی بہت دھوم سے کی تھی۔ مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ بلحاظ ذرہ نوازی اس تقریب میں رونق افروز ہوئے اور تمام ارکان دولت شریک محفل تھے۔ پیرو میر نے اس کی تاریخ نظم کی ؎

نقیب بانگ نقابت زوند پیش نگاہ

اس مصرع سے سنہ ۱۲۴۷ھ نکلتے ہیں اور تاریخ فارسی میں ہے اس وقت یہ جوان تھے کم سے کم بیس برس کا سن ہو گا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ منشی سید ناصر علی صاحب سہارنپوری بیان کرتے تھے کہ شیخ صاحب فرماتے تھے میں نے دس گیارہ برس کے سن میں میر تقی میر کو دیکھا تھا وہ نہایت ضعیف اور دُبلے پتلے تھے۔

شیخ صاحب کی اولاد کوئی نہ تھی انھوں نے اپنی شادی تک نہیں کی ہمیشہ لیلائے سخن کے دیوانے رہے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ عروس سخن سے جس نے عقد کر لیا ہو اس کو دوسرا نکاح جائز نہیں۔ مزاج میں ابتدا سے وارفتگی تھی۔

مولوی تفضل حسین صاحب شیدا لکھتے ہیں کہ میں نے چند بار بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلک میں جمع کیا لیکن مصنف کی ژولیدگی خاطر نے اسے برباد کر دیا۔ اکثر مجنون ہو جایا کرتے تھے اور دیوان کھو جاتا تھا آخر مولوی محمد یعقوب صاحب مالک مطبع نجم العلوم کی کوشش سے شیخ صاحب نے پھر از سر نو کلام مرتب کیا دو دیوان مرتب ہوئے ایک فارسی قافیوں کا ایک ہندی قافیوں کا ایک کا تاریخی نام "سخن بے مثل" دوسرے کا تاریخی نام "سخن بے مثال" رکھا۔

پہلا دیوان ہزار مشکل سے چھپنے پایا تھا کہ دوسرا دیوان کھو گیا۔ اسی غم غلط کرنے کو کہتے ہیں ؎

کھو گیا جو دوسرا دیوان کیا تھا کچھ نہ تھا

مگر حقیقت میں شیخ صاحب کو دوسرے دیوان کے کھونے کا سخت صدمہ ہوا۔ میر تقی میر کے صرف ایک فرزند میر محمد عسکری عرف میر کلو عرش تھے جو اپنے موروثی مکان واقع محلہ مفتی گنج میں رہتے تھے۔

میر کلو بہت سیاہ فام لاغر اندام میانہ قد تھے اور افیون کثرت سے پیتے تھے۔ میر نے تو کسی وقت میں شاید علینی ہی کیا ہو۔ لیکن عرش غریب کی تمام زندگی افلاس اور مصیبت اور پریشانی میں کٹی۔ ان کی نازک مزاجیوں نے عروج حاصل نہ ہونے دیا۔ منشی باقر علی منیر مرحوم کہتے تھے کہ میر کلو عرش کی صرف ایک لڑکی تھی اور ایک نواسا زندہ موجود ہے جو غریب یکہ ہانکتا ہے۔ دال کی منڈی میں رہتا ہے۔ شیخ صاحب کو میر عرش سے شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

عرش مرحوم کے شاگرد گنتی کے تھے۔ شیخ فدا علی عیش منشی سرفراز علی قمر۔ شاد۔ فلک مگر یہ سب عروضی تھے۔

عرش کے افلاس نے سب سے بدتر اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اُن کے بعد خاندان ناسخ نے یہ الزام اُن کے سر رکھا کہ ناسخ سے ان کو تلمذ تھا۔ حالانکہ یہ امر قرین قیاس نہ تھا۔ عرش کی نازک مزاجی ایسی باتوں کو کب قبول کرنے والی تھی۔ دوسرے وہ ان لوگوں میں تھے جن کو ناسخ اُستاد کہا کرتے تھے اور اُن کے صلاح و مشورے سے زبان میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ فلک کے انداز طبیعت سے عرش بہت ناخوش تھے اور کہا کرتے تھے۔ اس کو شاعری کا فن شریف ہرگز نہ آئیگا ہاں کچھ تک بندی کرے گا۔

شاد پیرو میر بالکل میر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہی زبان کہتے تھے۔ اس لئے عرش ان کو پیرو میر کہا کرتے تھے۔

شیخ صاحب کی شاعری میں یہ بڑا کمال تھا کہ ہر غزل میں ایک مثل محاورے اور اصطلاح میں نظم ہے۔ اپنے عہد کے تمام محاورے جو غزل کے رنگ میں آ سکتے تھے نظم کر دیئے اصطلاحات کا جس قدر رسالہ شیخ صاحب کے دیوان سے مل سکتا ہے وہ دوسروں کے کلام میں سوائے میر تقی میر کے نصیب نہیں۔ حقیقت میں یہ اسی رنگ کے بادشاہ تھے۔ ہندی قافیوں کا جو دیوان کھو گیا تھا انھوں کا شیخ صاحب کو بہت رنج تھا۔ آخر رفتہ رفتہ ہندی قافیوں میں دوسرا دیوان تمت

کیا جو اُن کے انتقال کے بعد چھپا ایک مثنوی چار دُرویش تظم کی تھی جس کا نفس قصّہ باغ و بہار کے علاوہ ایک بادشاہ ایک وزیر ایک جوہری ایک سوداگر کی عبرت افزا داستان تھی طبع ہوچکی ہے۔

ایک کتاب میں "صرف ونحو" چار زبانوں کی لکھی تھی۔ اردو' فارسی' سنسکرت' اور عربی قصیدے بہت سے لکھے۔

سر راجہ امیر حسن خاں بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای مرحوم والئی ریاست محمود آباد سے تیس روپیہ ماہوار مقرر تھا اسی میں اوقات بسر کرتے تھے۔ مرد قانع اور وضعدار تھے۔ فارسی شاعری میں آغا شیرازی کے شاگرد تھے۔

شیخ صاحب کی تصویر یا فوٹو یا حلیہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ غالب کو چھپاؤ اور ان کو نکالو۔

اس قدر صورت بہت کم ملتے کسی نے دیکھی ہوگی۔ وہی لمبا قد وہی دُبلا جسم وہی لمبوترا چہرہ وہی گندمی رنگ۔

شیخ صاحب کہتے تھے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ہم سے لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ ناسخ اور آتش کے معرکہ آرا مشاعروں میں شیخ صاحب اکثر شریک ہوتے تھے۔ آتش کو خوجی کہتے تھے اور ان کے بہت معترف تھے۔

علم موسیقی میں بھی بہت کچھ دخل تھا۔ اور اپنے کمرے میں اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ اپنے بھائی کے ساتھ پاٹے نالے پر رہتے تھے۔ اور اکثر ناراض ہوکر نواب صادق علی خاں کے مکان پر اُٹھ آتے تھے۔ آخر زمانے میں بیس برس سے شاعری ترک کردی تھی۔ غزل نہیں کہتے تھے لیکن رؤسا کے اصرار سے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے اور غیر طرح کلام پڑھتے تھے۔ پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا اور بہت بلند آواز سے پڑھتے تھے جس سے تمام محفل مستفید ہوتی تھی۔ پانی کا گلاس سامنے رکھا رہتا تھا۔ جب غزل پڑھنے میں حلق خشک ہونے لگتا تو دو ایک گھونٹ پی لیتے تھے۔

اکثر ان سے زیادہ سن رسیدہ لوگ ان سے اصلاح لینے آتے تھے۔ جیسے کاکوری کے شیخ عظمت علی صاحب عظمت جو بہت اچھا کہتے تھے اور نہایت ضعیف تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی سید محمد صاحب واثق خواجہ بادشاہ علی صاحب صفیر جناب ننھے آغا صاحب آبر منشی سید عاشق حسین صاحب وصل تھے۔

آخر وقت میں اصلاح دینا ترک کردیا تھا۔ مجھکو بھی شیخ صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے

یہ جس وقت اصلاح کے لئے شیخ صاحب کی خدمت میں گیا تو فرمانے لگے "بھائی میں تو اب اصلاح نہیں دیتا۔ بیس برس سے غزل کہنا ترک ہے۔ اللہ اللہ کیا کرتا ہوں ہر آن دم کو دم واپسیں جانتا ہوں۔ دوسرے شاعری میں اب کیا رکھا ہے۔ قدردانی کا زمانہ نہیں ہے۔ اس لئے تو کوئی اور کمال حاصل کرو۔ آج کل لوگوں نے شاعری کو دل لگی سمجھ لیا ہے۔ دو چار مصرعے الٹے سیدھے کہہ لئے اور شاعر بن بیٹھے۔ اگر ایسی ہی شاعری کرنا ہے تو بہت سے شاعر ہیں۔ ان سے اصلاح لے لیا کرو۔ اور اگر کچھ فن حاصل کرنا ہے تو میں کچھ عروض و قافیہ پڑھا دوں گا۔ متروکات سے واقف کر دوں گا محنت کرو گے تو کچھ ہو جاؤ گے۔ ایک شرط ہے جب تک کتاب العروض و رسالہ قافیہ لاماسم گنا یاد نہ کر لو اس وقت تک ایک مصرع بھی نظم نہ کرنا" یہ سب شرطیں منظور کرنا پڑیں اور تین برس تک پاپڑ بیلنا پڑے۔ شوق کہتا تھا کہ غزل کہئے اور مشاعروں میں شریک ہو جیئے لیکن شیخ صاحب کا خوف غالب تھا۔ اس لئے دلی جذبات کا خون ہوتا تھا۔ کیونکہ مزاج میں غصہ بہت تھا۔ اگر انکار کر دیتے تو پھر عمر بھر اصلاح نہ دیتے۔ اور ایسا ہی کئی شاگردوں سے کر چکے تھے۔

ایک سب رجسٹرار لکھنؤ میں منشی محمد نصیر صاحب کاظمی تھے جو طبیعت دار تھے اور غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ انہوں نے ایک مثنوی نظم کی تھی۔ اس پر شیخ صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے۔ ان کے پاس شاگرد ہونے آئے تو آپ نے ان سے بھی اقرار لیا۔ یہ بھی مضائقہ کیا ہے دو چار مہینے عروض قافیہ بھی دیکھ لیں گے اور درمیان میں اپنی مثنوی پر اصلاح بھی لے لیا کریں گے۔ شرطیں منظور کر لیں اور سبق پڑھنے لگے۔ ہفتے عشرے کے بعد اثنائے سبق میں اپنی مثنوی پیش کی۔ اور کہا میری خوشی یہ ہے کہ اس کے دو چار صفحوں پر آپ اصلاح فرما دیں۔

انہوں نے فرمایا شاید تم کو اپنا وعدہ یاد نہیں رہا۔ خیر اس مرتبہ تو شاد کر آج ہے نہ لانا مثنوی سن کر اس پر اصلاح دی اور کہا اگر فن جانتے ہوتے تو شاید اس قدر اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی شامت اعمال سے انہوں نے بیس روز کے بعد ایک دفعہ پھر مثنوی پیش کی اور کہا چند صفحہ ملاحظہ فرما لیجئے۔ شیخ صاحب آگ ہو گئے۔ سارے بدن سے تھر تھر کانپنے لگے۔ اور فرمانے لگے بس اب جائیے آج سے ہمارے آپ کے قطع تعلق۔ پھر لاکھ لاکھ عذر کئے ایک نہ سنی اور ان کو اصلاح نہ دی نہ عروض پڑھایا۔

شاگرد کو بیٹے سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہم نے دوسرا دیوان ان کا بہت کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ

ہمارے زمانے میں شیخ صاحب کی آنکھوں پر نزلہ کا بہت زور تھا۔ یہاں تک کہ پُتلیاں پتھرا گئیں تھیں اور ہاتھ میں شدید رعشہ تھا۔ کہنے کو تو کہا کرتے تھے کہ "میں غزل نہیں کہتا" مگر شاعری اُن کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی۔ اور ہر وقت فکر سخن میں رہتے تھے۔ سوائے شاعری کے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عروض و قافیہ اور متروکات کی تحصیل کے بعد ہم نے غزل کہی۔ اور بہت جانچ کر کہی۔ جس وقت ہم اپنی غزل سُنا رہے تھے مولوی غلام حسین قدر بھی شیخ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ یہ سُن کر کہ یہ پہلی غزل ہے۔ بہت تعریف کی شیخ صاحب نے فرمایا۔ تین برس میں نے اس کے ساتھ مشقت کی ہے۔ تم میری تعریف نہیں کرتے اس کے مداح ہو۔

دو برس کے بعد راجہ صاحب محمود آباد کربلائے معلیٰ جانے لگے۔ شیخ صاحب نے بھی اُن کے ہمراہ جانے کا قصد کیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا سن اس قابل نہیں کہ راہ کے مصائب برداشت کر سکئے۔ کہنے لگے یہی تو خواہش ہے کہ کربلا پہنچتے پہنچتے دم نکل جائے۔ اور وہیں کی مٹی میں مٹی ملجائے۔ جانے کے دو چار مہینے کے بعد خبر آئی کہ شیخ صاحب نے کربلائے معلیٰ میں انتقال کیا سب کو بہت صدمہ ہوا۔ دوست احباب نے اُن کے مرنے کی تاریخیں موزوں کیں لیکن پھر راجہ صاحب کے ہمراہ صحیح و سلامت تشریف لائے۔

شیخ صاحب کو اچار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ دیکھتا ہوں تو ایک بڑی سی ٹھلیا میں اچار ہے۔ ایک چمچہ سے آپ نکال رہے ہیں۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو برابر سے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا آپ نکالتے ہیں۔ اس میں تو کیڑے پڑ گئے ہیں ہنس کر کہنے لگے تو کیا مضائقہ ہے۔ اسی کے تو کیڑے ہیں۔ یہ کہکر کہنے لگے تم نے میرا نقصان کیا۔ مجھکو تو سوجھتا نہیں ہے اگر تم مجھ سے نہ کہتے تو اسی طرح برابر کھایا کرتا اور کچھ خبر نہ ہوتی۔

جب کربلائے معلیٰ سے واپس آئے تو کچھ دنوں کے بعد نواب صادق علی خاں کے مکان پر اُٹھ آئے تھے اور وہیں رہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کا دولت خانہ میرے مکان سے قریب تھا۔ میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور اُستاد کے پاس بیٹھتا تھا۔ شیخ فدا علی عیش بھی آتے تھے۔ ایک روز میں نے کہا اب آپ کو چاہئیے کہ نماز پابندی سے پڑھا کیجیے کیونکہ آپ زیارت کر آئے ہیں۔ کہنے لگے تو زیارت کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ میں نماز کا پابند ہوں اور آخر تم لوگ نماز پڑھتے ہو کچھ مجھکو بھی ثواب ملتا ہوگا۔ میں نے کہا میری نماز آپ کے کس کام کی۔ اس لئے کہ میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا ہوں اور آپ کی بخشش کے لئے ہاتھ کھولکر نماز پڑھنا

لازم ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا تو اب نماز بھی گلے پڑی۔

ہر ایک ملنے والے کو کہا کرتے تھے کہ یہ ہمارا آشنا ہے۔ میں نے کہا اُستاد "آشنا" ایک کریہہ لفظ ہے۔ آپ دوست کہا کیجئے۔ کہنے لگے تم بچے ہو۔ دوست اس زمانے میں کہاں ہیں۔ آج کل کے ارباب پس پردہ دشمنی کرتے ہیں۔ ان کو دوست کہنا کفر ہے۔ وضع کی پابندی یہ تھی کہ کبھی کبھی خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کے یہاں ملاقات کو جاتے تھے، گرمی ہو یا سردی لیکن اُن کا معمول بہت کم ترک ہوتا تھا۔

اتوار کو جب پوچھا یہی کہا کہ سبزی منڈی جاتا ہوں۔ کرٹھی تک ایک آشنا سے ملنا ہے۔ روز سہ پہر کو ہوا کھانے شاہ مینا تک جاتے تھے۔

مکان پر جو گوشہ یہ ٹوپی دیئے ایک لنگی باندھے ہوئے حقہ پیا کرتے تھے۔ جب دیکھئے فکر سخن، دیوان کھلا ہوا ہے۔ بار بار ترمیم و تنسیخ ہو رہی ہے۔

نازک مزاجی روسا سے ملنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اخبار اودھ پنچ شیخ صاحب کے عقیدتمند شاگرد تھے۔ اور ان کو چچا کہا کرتے تھے۔

آخر زمانے میں شیخ صاحب نے اپنی تمام تصنیف مجلدات اڈیٹر اودھ پنچ کے حوالے کیں اور کہا تم سے ممکن ہو تو بصحت ہماری تمام تصنیف چھپوا دینا۔ ایک روز دفتر اودھ پنچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً ہاتھ پاؤں میں تشنج ہونے لگا۔ اور یہ کرسی پر سے گر پڑے معلوم ہوا کہ فالج گرا ہے۔ آخر ڈولی میں سوار کر کے گھر پہنچوائے گئے۔ یہاں آتے آتے شام تک روز یکشنبہ ربیع الثانی کی چھٹی تاریخ ۱۳۱۲ھ کو ستانوے برس کے سن میں انتقال فرمایا۔

پہلے دیوان میں ایک تقریظ مولف نے لکھی ہے جس میں یہ دکھایا ہے کہ سابق کے ریختہ گو شاعر اپنے کلام میں غیر مانوس الفاظ خلاف تلفظ اردو سے ملا نظم کرتے تھے اور الفاظ ثقیل ٹھیٹھ ہندی کے اور الفاظ غیر صحیح بھاکا کے جو عوام کی زبان پر تھے لکھ جاتے تھے۔ عالمگیر کے عہد میں میر حاتم دہلوی نے کلام کے عیوب ظاہر کر کے متروکات کی بنا قایم کی اور موجد اس طرز کے حاتم دہلوی ہیں۔ انہیں کی تقلید میں شیخ صاحب نے اپنے دیوان کی لوح پر اپنے متروکات لکھ دیئے۔ جو سنہ ۱۲۰۰ھ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانہ میں اُستاد عرش کی صلاح سے مقرر کئے تھے۔

شیخ صاحب کا کلام اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے اکثر شعر اردو قصص کی کتابوں میں

پائے جاتے ہیں اور اکثر شعر لوگوں کی زبان پر ہیں۔

نکہت برباد تھا غنچہ کا حسن مسکراتے ہی نہ وہ عالم رہا
صدف کی طرح توکل تو کر ذرا اے شاد پھر احتیاج جو قطرے کی ہو گہر لینا

قریب ہے یار روزِ محشر چھپیگا احوال قتل کیونکر جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا
کیا کیا قتل تو نے قاتل ہوا ہوا خون مجھ حزیں کا ارے گریباں نہ کوئی پکڑے لہو تو دھو جیب آستیں کا

مجھے شاد بخش رہا نہ وہ کیوں بغیر پوچھے میں کسی شمار میں تھا جو مرا حساب ہوتا

ہر حال میں شکستہ دلِ ناصبور تھا شیشہ بھی تھا تو سنگِ حوادث سے چور تھا

ذہن میں رازِ محبت بہ مشکل آیا دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا

تیر مارا نہ نیشتر مارا غیر سے آنکھ مار کر مارا

ہمیشہ ہے تہ و بالا زمانہ سنڈولہ دورۂ افلاک نکلا
عجب حسن و جمال آدمی ہے کہ محبوب خدائے پاک نکلا

چلتی ہے سانس جب تک قائم ہے بزمِ اعضا
اے دم ہے تیرے دم تک جلسہ اس انجمن کا

اے شاد گبر و مومن دونوں سے میل رکھے
تسبیح میں ہو ڈورا زنار برہمن کا

تیر مجھ زار کی طرف مارا آپ نے تو بڑا ہدف مارا

جو میری چوٹ پہ غیروں کا اس نے نام لیا لگا جگر میں وہ گھونسا کہ دل کو تھام لیا
مشکل میں کب کسی کا کوئی آشنا ہوا تلوار جب گلے سے ملی سر جدا ہوا

کی پرستش بہت اب کام دعا سے ہوگا اے بتو تم سے جو ہوگا وہ خدا سے ہوگا
دل سلگتا ہے تو شعلہ ہے جگر سے اٹھا یہ دھواں دیدۂ تر دیکھ کدھر سے اٹھا
شب وصل یہ صبح ہونے کا ڈر تھا نہ پوچھی پھٹی تھی کہ ٹکڑے جگر تھا

یہ دتیا ہے صدا سنگ آسیا کا خدا رزاق ہے بے دست و پا کا
ہاتھ چھوٹا پڑ گیا مجھ پر جو اس خونخوار کا پیتے ہی خونِ جگر منہ آگیا تلوار کا
روح بولی پھینک کر پشتارہ جسمِ زار کا اک اکیلے سے نہیں اٹھتا ہے بوجھا چار کا
ظالموں کی ہے کمی کیا ستم ایجاد بہت سر سلامت ہے تو ملجائینگے جلاد بہت

ثمر توڑ اس چمن میں یا شجر کاٹ — کسی کا حق نہ لیکن اے بشر کاٹ

زلفوں کے اسیر ہیں جو دربند — آنکھوں کے فقیر ہیں نظربند

پاؤں رکھیں نہ فرشِ دیبا پر — لات ماری ہے ہم نے دنیا پر

جیسے گرا ہے کوہِ الم جہاں پر — ٹوٹیں فلک الٰہی یونہیں اس آسماں پر

اُٹھے ابرِ کرم چھا جائے اے دامنِ تر — آنچ آئے نہ جہنم کے گنہگاروں پر

اب ہے نیرنگِ سخن سب کا بیاں ہی کچھ اور — پیر و فقیر ہوں میں میری زباں ہی کچھ اور

چھپاتا ہے صیاد کیوں مرگِ بلبل — پڑے ہیں تو ہیں یہ شجر سے کچھ پر سے باہر

یہ نرمی سخت گیروں میں کی رطب اللساں ہو کر — بسر کی عمر بھر بتیس دانتوں میں زباں ہو کر

میں وہ مسکین ہوں جو ہیں پہنچا درِ گلزار پر — تاکنے انگور کی بیلیں چڑھیں دیوار پر

زشت روئی نہ حسنِ صورت شرط — آدمی کو ہے آدمیت شرط

گئے تھے بھول کر رستہ حرم تک — خدا لایا ہمیں بیت الصنم تک

کیا دوں نشانِ قاتل ہوں ناتواں یہاں تک — پھرتا ہے نام دل میں آتا نہیں زباں تک

نہ تو گوہر ہے نہ زر ہے دلِ بے حال کا مول — نگہ لطف خریدار ہے اس مال کا مول

مرنے پہ باندھے کمر سرگرم بازاروں میں ہوں — جان کا گاہک جو ہے اُسکے خریداروں میں ہوں

جس شخص میں ہو نہ آدمیت — حیوان ہے وہ جامۂ بشر میں

بلبل کا خونِ ناحق گلچیں چھپے گا کب تک — آخر یہ اک نہ اک دن پھولیگا گل چمن میں

اس درجہ ہیں ملایم اعضا سب اُسکے تن میں — مثلِ زباں سراپا ہڈی نہیں بدن میں

دیرینہ شوق مے کا اے شاد پوچھنا کیا — کیفیتیں ہیں تازہ جامِ مئے کہن میں

چڑھے اُس سے ہوں دکھائیں جیسے گھونگر گیسو — کچھ نہ بندے کے خدا ہیں نہ پیمبر گیسو

اوج اگر خلق میں چاہے تو نگونساری کر — پاؤں پڑنے سے حسینوں کے چڑھے سر گیسو

اس طرح دینے کو سائل سے ملا ہاتھ سے ہاتھ — کہ نہ آگاہ ہوا ہے کانِ سخا ہاتھ سے ہاتھ

آدمی جز غمِ بے بال و پری کیا جانے — لطف پروانہ کا مٹی کی پری کیا جانے

منہ سے نکلی جو ہیں اللہ نے فوراً سُن لی — ہم فقیروں کی دعا بے اثری کیا جانے

ازلی دو جہاں کی ہستی ہے — نئی دنیا پرانی بستی ہے

مرنے پہ ہو چین سب گماں ہے — نیچے بھی زمیں کے آسماں ہے

خدا گواہ ہے نہ نظروں سے ہے نکتہ چینیوں کی — چڑھے ہوئے ہیں نگاہوں پہ عیب بینوں کی
روتے جب سامنے تربت آئی — مر گئے ہم تو محبت آئی

قسمت میں اگر اولاد نہیں اشعار سے اپنا کام چلے — دنیا سے اٹھیں جب مہر صفت تا حشر ہمارا نام چلے

جو ناوک مژہ ہے اک تیر بے اماں ہے — جیتی بھووں پہ قرباں دو نانگ کی کماں ہے
سایہ کرے جو سر پہ کٹتا شجر وہی ہے — باغ جہاں میں سچ ہے نیکی کا پھل بدی ہے
یہ شور کرتی ہے ہر موج دیدۂ تر کی — کہ میری دھار سے ہے آبرو سمندر کی
عشق انساں میں خدا بھی رشک سے خالی نہیں — گم کیا سایہ نبی کا بدگمانی کے لیے
جوانی جاتی ہے خطِ رخِ جاناں آتا ہے — بڑھاپا راہداری کا لیے پروانہ آتا ہے

خوشبو کی عطا گل کو جب اس شوخ نے زر بھی — منہ پھوڑ کے غنچہ نے کہا کچھ تو ادھر بھی
وہ مرغ گرفتہ ہوں کہ باندھے گئے بازو — پرواز کے قابل نہ ہوئے تھے ابھی پر بھی

کسی کا پردۂ عزت جنوں کتاں نہ کرے — خدا برہنہ کرے ننگِ خانداں نہ کرے

گوش کر منقلب زمانہ ہے — آج کا ذکر کل فسانہ ہے
قتل کرتا ہے قاتل عالم — ملک الموت کا بہانہ ہے

فاقہ کش ہوں پہ شکر صحت ہے — تندرستی ہزار نعمت ہے

ناتوانی سے یہ حالت ہے دلِ ناکام کی — مہر تک بھی اٹھ نہیں سکتی ہمارے نام کی

ہوں وہ خرمن جو بچوں برق کی شتابی سے — بجلیاں مجھ پہ گریں خود مری بیتابی سے

گر پڑے آنسو تو جا کر شمع نے فریاد کی — یہ مثل سچ ہے بری ہوتی ہے آنچ اولاد کی

آنکھیں سینکیں غیر اس بت سے دلِ مضطر جلے — وائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے

دامن آدم نہ نوح کا تر ہے — رو چکے سب نچوڑ ہم پر ہے

فرشِ زمیں پہ نہ نازاں ہوں یہاں زر والے — خاک پر سوتے ہیں کمخواب کے بستر والے

داغ دل اس بت کی نظر پر چڑھے — پھول وہی ہے جو سہرے چڑھے

لب تک آ سکتی نہیں جو جی کی حسرت دل میں ہے — آرزو ہم ناتوانوں کی بڑی مشکل میں ہے
جز نکیرین اور کچھ کھٹکا نہیں ہے تا عدم — ایک ڈر ان دو ٹھگوں کا گور کی منزل میں ہے
اے زہے رنجش کہ قلب یار کی منزل میں ہے — مرتبہ دیکھو مرے کینے کا کہ اس کے دل میں ہے
دیدنی حشر کی اے محشر لو سیر تو ہے — پر یہ ہنگامہ تو شر گیا ہے کہو غیر تو ہے

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے / بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے
خجل پیشِ خدا جاتے ہیں انساں شرمِ عصیاں سے / کفن سے منہ چھپا کر ہر بشر روپوش ہوتا ہے

زبانِ حال سے کہتی ہے یہ لو آتشِ غم کی / مرے آگے ہیں ٹھنڈی گرمیاں نارِ جہنم کی

مرے مضموں ہیں غیروں کے سخن میں / مری دولت نصیبِ دشمناں ہے
مجھی تک نام روشن ہے مرا شاد / مرے پر گل چراغِ دودماں ہے

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے / گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے
جا رہی یارب ہے خلعت میں شہادت کے ملیں / کرے چو رنگ جو نیت مرے جلاد کی ہے
سخت باتوں کا پہنچتا ہے جو صدمہ دل کو / وہ کڑی چوٹ نہ پتھر کی نہ فولاد کی ہے
ہم فقیروں کے تجرد پہ نہ جا اے شہِ حسن / دل گرفتار ہیں صورتِ الف آزاد کی ہے
سیپ تک سے ہے جگر چاک پئے درِ یتیم / مامتا کونسی ماں کو نہیں اولاد کی ہے
حسن بینی سے نظر کی تو یہ معلوم ہوا
سائے کے کعبے میں تصویر پریزاد کی ہے

فغاں نکلے دلِ پر آرزو سے نالہ یا نکلے / وہ ارمانوں کو لے نکلے دہن سے جو صدا نکلے
میں وہ ہوں کلمہ گو اے شاد سنتے ہی سخن جس کا
دہن سے منکرِ دین کے بھی صلِ علیٰ نکلے

آ کے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے / خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے
گھر کو چھوڑے ہوئے مدت ہوئی صیاد مجھے / کس چمن میں ہے نشیمن یہ نہیں یاد مجھے
دل لگاتے ہی گرا آنکھ سے آنسو کی طرح / یہ نہ معلوم تھی اس عشق کی افتاد مجھے
خوش نہیں کوئی جہانِ گذراں میں سفری / نظر آتا ہے جرس تک دلِ ناشاد مجھے
کوئی خالی نہ اثر سے ہو مرا طفلِ سرشک / ناخلف دے مرے اللہ نہ اولاد مجھے
گھٹ کے مر جاؤں یونہی تا دہن آئے نہ فغاں / کھولنے دے نہ خموشی لبِ فریاد مجھے
عشق میں آلِ محمد کے جنوں ہو اے شاد
پابہ زنجیر کرے الفتِ سجاد مجھے

خط دے کہ نہ دے مصحفِ داور تو نہیں ہے / کچھ قاصدِ محبوب پیمبر تو نہیں ہے
کیوں سنگِ حوادث سے نہ ٹوٹے دلِ نازک / آئینہ ہے کچھ سدِ سکندر تو نہیں ہے

ہے وحیِ الٰہی کا خطِ یار یہ دھوکا
جبریل کے جامے میں کبوتر تو نہیں ہے

کج ابروِ قاتل ہے تو ہو غم نہیں اس کا
منھ حلق سے پھیرے ہوئے خنجر تو نہیں ہے

تعالی اللہ ترشح کر یہ ہوئی توقیر پتھر کی
خدائے کعبہ بن بیٹھی ہر اک تصویر پتھر کی

نگاہِ غور کر حسنِ بتاں پر چشمِ خود بیں سے
خدا کی شان دکھلاتی ہے ہر تصویر پتھر کی

مسطورۂ بالا اشعار دیوانِ اوّل سخنِ بے مثل کے ہیں جو ۱۲۹۲ھ میں چھپا تھا اور اب کمیاب ہے سچ تو یہ ہے کہ ملک الشعرا میر تقی میر کے یہاں بہتر نشتر تھے اور پیر و میر کے پاس ہزاروں تیر ایسے ہیں جو جگر میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بازاری زبان سے پرہیز کیا ہے۔

عرش کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت کم ہے مگر یہ بات ہے کہ اس وقت میں لوگ بہت سے شاگرد کر لینا عیب سمجھتے تھے۔ خود میر کے شاگرد بہت کم تھے ہاں جس کو شاگرد کرتے تھے۔ پہلے اس کی طبیعت کا اندازہ، دلی شوق، دریافت کرتے تھے اور اس بات کو پرکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ خلقی شاعر ہے کہ نہیں پھر اس کو اپنی طرح نامور اور مستند بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اولاد سے کم نہ سمجھتے تھے۔ شاگرد بھی اُستاد کی خدمت کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔

آج کل لوگ بے فن حاصل کئے شاعر بن بیٹھتے ہیں اور عیوب شاعری سے پرہیز نہیں کرتے وہ اہلِ فن کی نظر میں ہمیشہ ذلیل رہتے ہیں۔ بعض بد اصل اپنے استاد سے منحرف ہو کر خود استاد بن بیٹھتے ہیں اور دعوے بے دلیل کرتے ہیں اور فن شعر میں غلط ترمیم و تنسیخ کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا کلام مقبول نہیں ہوتا اور احسان فراموشی چند روزہ نمود کے بعد ذلیل کرتی ہے۔

اس لئے اگلے شعرا کا قول تھا کہ شریف آدمی کو یہ فن سیکھنا چاہیے۔

شیخ صاحب نے ابتدا سے عرش سے اصلاح لی اور مرتے مرتے استاد کا دم بھرتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ہر شعر دل میں اثر کرتا ہے اور یہی نہیں کہ صرف غزل گو شاعر ہوئے بلکہ شاعری کے جملہ اصناف پر قادر تھے۔ غزل کے بعد ہم اور صنف سخن بھی پیش کرتے ہیں۔

رباعی

غمناک ہے فرطِ غم سے چشمِ گرداب   ماتم کی بچھائے صف ہیں موجیں بر آب
یہ ڈوب مولہے کون بیکس یا رب   دریا میں جو پھوٹ پھوٹ کے روتی ہیں حباب

جس روز کہ رخصت شہِ والا تھی   بیمار مدینہ پہ عجب ایذا تھی
بچپن میں بچھڑنا پدر و مادر سے   صغرا کے لئے قیامتِ کبریٰ تھی

دنیا میں خوشی جو کوئی دم ہوتی ہے   افزائش رنج و غم بہم ہوتی ہے
ہے شاد ترقی و تنزل توام   بڑھتا ہے جو سن تو عمر کم ہوتی ہے

قطعات

ظاہر ارشد یہ دیتے دم ہیں   مے کشی کرتے نہاں بے غم ہیں
کھل گیا پیتے ہیں پوشیدہ شراب   شیخ و زاہد بھی چھپے رستم ہیں

آبلوں کو ہوئی خار دل سے جو یاس   لب شبنم کی نہ کیا ہے ہراس
تو ہی منصف ہو یہ کانٹوں نے کہا   اوس چاٹے نہیں بجھتی ہے پیاس

تاریخ عقد مرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ

جب ز عقد شہنشاہ اودھ   کد خدا شد چو بعد زینت و زین
مصرع سال ہمایوں گردید   شد قران قمرین سعدین
۱۲   ۵۰   ۴۹

تاریخ ختنہ

بنو نواب اسد علی خاں   مختون بہ خود نور دیدہ
گلچین بہار بہر تاریخ   گلشن از شاخ گل بریدہ
۱۲   ۴۲

مخمس بر غزل عرش مرحوم

سنبلیں مو صنم سیمِ ذقن ہیں تھرکے   لالہ رخسار بتِ عہد شکن ہیں تھرکے
گلبدن رشک گل نسرین و سمن ہیں تھرکے   سرو قد غیرتِ عہد غنچہ دہن ہیں تھرکے
تبکدے میں نظر آتے ہیں حسین تھرکے

یہ برومندی روزی سے ہے عالم خرسند — سیر ہوتے ہیں شب و روز چرند اور پرند
سنگدل کا بھی ازوقہ کبھی ہوتا نہیں بند — آسیا کہتی ہے ہر صبح بہ آواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کے

مال و دولت پہ نہ مغرور جہاں میں ہو کوئی — ہو گیا خاک جو قاروں نے امارت کی لی
بے ثباتی میں ہر انسان ہے تصویر گلی — منعمو مٹی میں مل جائے گی آخر مٹی
قصر سنگیں سے نہیں خانۂ تن پتھر کے

شاد کو یاد جو آتا ہے شباب اپنا عرش — وہ ضعیفی میں ہے ہر بار یہی کہتا عرش
نوجوانی میں تو کل زور کئے کیا کیا عرش — بھول اب رعشۂ پیری سے نہیں اٹھتا عرش
تو لیتے تھے کبھی ان ہاتھوں سے من پتھر کے

قصاید

قصیدہ در مدح شہزادہ برجیس قدر بہادر

ہوئی جو برہم ہما لشکر کو خواہش زر — اودھ کے شاہ کا عیسائیوں نے لوٹا گھر
لٹا یہ مال کہ خاک اڑ گئی خزانے میں — بجائے درہم و دینار رہ گئے پتھر
گرے پڑے ہوئے ڈھیروں جہاں جواہر تھے — وہاں نہ نوبت کا جھلّہ رہا کہاں زیور
اک اہلکار جواری کی بد قماشی سے — تمام گنجینہ شاہی کا ہو گیا ابتر
ٹپک رہی در و دیوار سے اداسی ہے
برس رہی ہے خرابی ہر اک عمارت پر

شیخ صاحب کی شاعری کا اتنا مختصر نمونہ مشتے از خروارے سمجھنا چاہئے۔ ہر غزل میں یہی لطف ہے ہر شعر میں یہی مزا ہے حقیقت میں یہ شاعری نہ تھی سحر حلال کہئے۔

صفیر بلگرامی

زبان کی خدمت کرنے والوں کے نام دنیا کے صفحات سے بہت جلد مٹ رہے ہیں۔ انہیں میں ایک سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں۔ جن کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے۔ میر صاحب نے ابتدائی سن سے اردو زبان کی خدمت کی۔ اور بہت سی کتابیں تصنیف کر کے خود چھپوائیں اور یورپ میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا۔ ان کی ولادت ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔ اپنے وطن بلگرام میں بہت تھوڑا قیام کیا۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ ان کے آبا و اجداد وطن چھوڑ کر غریب الوطن ہوئے۔ اور آرہ ضلع شاہ آباد میں تشریف لائے۔ ناچار ان کا قیام بھی آرہ محلہ بھاٹک سادات میں ہوا۔ صفیر مرحوم کا مذہب اثنا عشری تھا اور بعض کا قول ہے یہ غالی شیعہ تھے۔ جب ذرا سن شعور کو پہنچے لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا۔ پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ان کی تعلیم فارسی کی درسیات تک ہوئی تھی۔ جو کچھ نظم کرتے تھے پوشیدہ رکھتے تھے۔ کسی کو دکھاتے نہ تھے۔ آخر دو تین سال کے بعد سید محمد مہدی خبیر سے اصلاح لینا شروع کی۔ جب کچھ کچھ شعر و سخن کا مزا آنے لگا۔ اور زبان کا لطف حاصل ہوا۔ تو شیخ امان علی سحر لکھنوی شاگرد رشید مرزا فتح الدولہ برق کی خدمت میں شاگردی کی درخواست کی۔ اور غزل اصلاح کے لئے بھیجی شیخ امان علی سحر زبان اور محاورات میں مشہور زمانہ تھے۔ اس وقت تمام شہر میں ان کی شہرت تھی۔ صفیر کی شاگردی کی درخواست کو شرف قبول بخشا۔ بہت دنوں تک اصلاح لیتے رہے۔ آخر مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ مرزا دبیر کی خدمت میں ایک مرثیہ بھیجکر اصلاح لی۔ اس کے بعد برابر مراثی لکھتے تھے۔ اتنے میں غدر کا ہنگامہ ہوا۔ لوگوں کے گھر لوٹے گئے۔ شرفا پریشان و تباہ ہوئے۔ امرا محتاج نان ہوئے۔ سحر نے بھی لکھنؤ چھوڑ کر غربت میں قضا کی۔ خدا جانے کس شہر میں انتقال کیا۔ کچھ پتہ نہ معلوم ہوا۔ صفیر نے بہت کچھ تلاش کی کسی نے خبر نہ دی۔ کچھ زمانے کے بعد پٹنہ میں مرزا صاحب مجلس پڑھنے کے لئے بلائے گئے۔ صفیر بھی ملاقات کو گئے۔ استاد کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مرزا صاحب نے بہت الطاف کئے۔ نواب الطاف حسین خاں سے ملاقات ہوگئی۔ صورت قیام نکل آئی۔ تو صفیر نے آرہ کا رہنا کم کیا

پٹنہ میں قیام کیا۔ یہاں شعر وسخن کا بہت چرچا تھا۔ اور لوگ قدر دان سخن تھے۔ یہاں رہکر تین مثنویاں اور پانچ قصے اردو میں لکھے۔ ایک کتاب "رشحات صفیر" تذکیر و تانیث میں تالیف کی۔ ایک تذکرہ "صلوۃ خضر" لکھا۔ غالب مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت شرف تلمذ حاصل کیا۔ غالب کے بعد میر غلام حسنین قدر بلگرامی سے اصلاح سخن لی۔ پٹنہ میں ان کے بہت سے شاگرد ہوئے۔ یہ مدعی تھے کہ خواجہ فخر الدین حسن مصنف "سروش سخن" بھی میرے شاگرد ہیں۔ وہ منکر تھے کہ میں اُن کی صورت سے بھی واقف نہیں۔ میں تو غالب کا شاگرد ہوں۔ ایسی ایسی بہت سی چوٹیں چلا کیں۔

صفیر نے نثاری کی طرف رخ کیا تو سب سے پہلے بوستان خیال کی اٹھارہ جلدوں کو فارسی سے اردو میں لانا چاہا۔ کچھ جلدیں ترجمہ کیں۔ دو جلدیں اپنے ہاتھ سے کاپی لکھکر اپنے مطبع میں چھپوائیں۔ پہلا دیوان بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھپوایا۔ دوسرا دیوان "خمخانۂ صفیر" مطبع کانا لکھنؤ میں چھپا۔

پہلا دیوان مطبع گلشن کشمیر خواجہ باقر علی خاں مالک مطبع کی اجازت سے حاجی حسن علی صاحب لکھنوی کے اہتمام سے پٹنہ میں چھپا۔ یہ دیوان ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوا۔ اس کا نام "صفیر بلبل" رکھا۔ اس کے بعد ایک قصہ روح افزا لکھا تھا جو طبع نہ ہوا۔ صفیر بہت پرگو تھے۔ "پیام یار" میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں۔ اور آرہ میں اکثر لوگ ان کے شاگرد ہوئے۔ قہر آروی قمر آروی وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ قمر نہایت خوشگو اور زندہ دل آدمی تھے۔ سید شاہ قمر الدین حیدر نام تھا۔ کچھ عرصہ ہوا انتقال کیا۔

منشی محمد اسمعیل صاحب مختار آرہ نہایت طباع آدمی تھے رنگکار کا بہت شوق تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ غرضکہ صفیر کے دم سے شعر وشاعری کا چرچا آرہ میں بہت تھا۔ اور پٹنہ میں بھی لوگوں کو ان کی وجہ سے مذاق سخن ہو گیا تھا۔ اور اچھے اچھے کہنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ جو صفیر کو سر مشاعرہ ٹوک دیا کرتے تھے۔ صفیر کے فرزند بھی تھے۔ ان کا حال ہم کو معلوم نہ ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد آرہ میں مذاق سخن نہ رہا۔ اب صرف ان کے شاگردوں میں سے ایک سید امیر حسن صاحب نبیرۂ مولوی عبد العزیز صاحب عزیز مرحوم آروی کا دم ہے جو ابھی تک شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ اور اچھا کہتے ہیں۔ صفیر کے شاگردوں کے علاوہ آرہ میں اور بھی بہت سے شاعر ہیں۔ حکیم محمد ضمیر الحق صاحب قبیس تلمیذ مولانا شمشاد لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بات یہ ہے کہ اب کوئی صفیر

جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا رہے۔ غازی پور میں مولانا شمشاد کی ذات غنیمت ہے۔ جو اب تک ہر ایک مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی ایک ذریعہ زبان کی خدمت کا ہے۔

صفیر مرحوم اگلی وضع کے آدمی تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ دراز قد تھے۔ کسی قدر ہکلاتے تھے۔ شعر پڑھنے کا بھی انداز اچھا تھا۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا۔ اور بندش چست۔ چند اشعار درج ہیں:-

جو ناناں مضامین پر ہے سایہ ربِ سبحاں کا
بنا طغرائے بسم اللہ سے تاج اپنے دیواں کا

الٰہی ہو صفیرِ خستہ کو حسن قبول ارزاں
رہے منظور اربابِ نظر ہر شعر دیواں کا

جھکا کر سر کیا جب وصیان خوبانِ پری رو کا
مرقع بن گیا پیشِ نظر آئینہ زانو کا

گرہ کیوں اپنی آبرو پر پڑی ڈالی آپ نے صاحب
ابھی تعقید سے ناآشنا مطلع تھا ابرو کا

اشاروں میں تمہارے لطف ملتا ہے سخنداں کا
نہیں تم نکتہ مصرع ہے یہ چشم سخن گو کا

اُس وقت میں واؤ معروف اور مجہول کا ایک غزل میں قافیہ کرنا شعرا میں جائز تھا۔ مگر اب ابرو کے ساتھ سخن گو نہیں باندھتے۔ کیونکہ سخن گو کو واؤ مجہول بولتے ہیں۔

دل صد پارہ وابستہ ہوا زلف چلیپا کا
رگِ لیلیٰ سے شیرازہ بندھا دیوانِ سودا کا

لب گویا پہ ان کے خط جو نکلا یہ ہوئی پھبتی
محشی فکر سودا سے ہوا دیوان گویا کا

چھوڑ دیجئے گا شاعری نہ صفیر
فکر عالی تمہیں خدا دے گا

"چھوڑ دیو" حال کے شعرا نے ترک کر دیا ہے۔ اب شعرا چھوڑنا بولتے ہیں۔

ابھی کشتی کو بچا اے نوح
جوش پر آج ہے طوفاں میرا

سب اپنی جان کو روتے ہیں دیکھ کر مردہ
کوئی کسی کے لئے چشم نم نہیں کرتا

شرابِ روح پرور سے مزا ہے زندگانی کا
اسی پانی سے ہے نشو و نما نخلِ جوانی کا

کچھ عجب انداز خلوت رات کی محفل میں تھا　　تو ہمارے دلمیں تھا اور غیر تیرے دلمیں تھا

یہ دل ہے یا کوئی قطرہ ہے اشک شبنم کا　　ہمیشہ ساقطہ رہا اسس کو دامن غم کا

تیرے انجام کا قلق ہے صفیر　　کاش تو مرد پارسا ہوتا

اس در کا رہنا دل بے کینہ ہو گیا　　قبلہ نما مرے لئے آئینہ ہو گیا

آتش گل کو جو بھڑکایا بہار باغ نے　　دود اٹھ کر سرمۂ چشم عنادل ہو گیا

عذر کرتے ہیں لو قصور ہوا　　کہدو منہ سے کہ رنج دور ہوا

ابر قبلہ سے دھواں دھار بشدت آیا　　ساقیا دوڑ کہ پھر موسم عشرت آیا

ختم ہے کبر و غرور اے بت ترسا تجھ پر

کہ تصور میں بھی آیا تو بہ منت آیا

جلوہ اس بت کا جو دیکھا تو خدا یاد آیا　　ہم نے بتخانے میں سجدہ پئے معبود کیا

خراب یار میں کب تک صفیر روئے گا　　خدا نکردہ کہیں اپنی آنکھ کھوئے گا

فکر ہے تیرے دہن کی کیسی　　دھوم ہے اپنے سخن کی کیسی

یہ کس کی یاد پڑی بیٹھے بیٹھے پال مجھے　　چلا میں آپ سے اے ہمنشیں سنبھال مجھے

تم لاکھ لاکھ طرح سے بندوں کو دو فریب　　لیکن تو خدا کی خدائی نہ جائے گی

تمہاری زلف کا دل سے خیال کیا نکلے　　پڑا جو آئینہ میں پھر وہ بال کیا نکلے

اس قدر یار نے نظروں سے گرایا ہے صفیر　　اپنے ہم چشموں میں اب مجھکو حیا آتی ہے

ہماری طبع اگر شعر کہنے پر آئے　　زمیں پہ عرش کا مضمون اٹھا لائے

کنٹر کے گرد ہوں جو پیالے چنے ہوئے　　قابو میں ہوں کباب بھی ساقی بھنے ہوئے

طبع بلند اپنی ہے خود انتخاب دہر
مضمون ہمنے پائے ہیں۔ سارے چھنے ہوئے

طور او رموسے کی کہانی اور ہے — ان بتوں کی لن ترانی اور ہے

ہم ہیں مجبور اور تم مختار — اے بتو! یہ خدا کی قدرت ہے

تبسم سے تکلم سے حیا سے — مجھے مارا بھی تو کس کس ادا سے

ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہو۔ اس کا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے نہایت افسوس کی بات ہے۔ امید ہے کہ ان کے تلامذہ توجہ کرینگے۔

شہنشاہ ظفر

جس طرح انگریزی سلطنت کی برکت سے اردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے شامل ہوتے گئے اور اس کو ایک نئی اردو بنا دیا۔ اسی طرح سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں فارسی اور عربی کے الفاظ کے شمول نے ہندی زبان کی کایا پلٹ کر دی تھی اور اس ملواں ہندی کا نام "اردو" ہو گیا جو وقت انگریزوں کو اردو حاصل کرنے میں ہوتی ہے اور جس کے لئے وہ کچہریوں کے تمام دفتر روز مرہ اردو سے انگریزی میں بدلتے ہیں۔ یہی تکلیف مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو اردو بولنے میں ہوتی تھی جن کی زبان پر ٹ، ڑ، ڈ، کے حرف اچھی طرح نہ آسکتے تھے۔ مگر مغلوں نے اپنی رعیت سے ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان کی زبان حاصل کرنے میں اپنی عمر کا کثیر حصہ صرف کیا۔ یہاں تک کہ دہلی کے آخری تاجور حضرت محمد سراج الدین بہادر ظفر شاہ اچھی خاصی اردو بولنے پر قادر تھے۔

اردو کے علم ادب میں ان کی تصنیف نے ایک تازہ روح پھونک دی۔ بہادر شاہ مرحوم کے چار موٹے موٹے دیوان تو مطبوعہ موجود ہیں اور خدا جانے اُن کی تصنیف کا کس قدر ذخیرہ غدر کے زمانے میں معرض تلف میں آگیا ہو گا جن کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک مغل کی تصنیف ہے جس کی مادری زبان ترکی اور فارسی تھی۔

اردو زبان کی ایسی مثال ہم کو کسی انگریز کے کلام سے نہیں ملسکتی۔ بہادر شاہ کی شاعری نے یہ قبولیت حاصل کی کہ وہ اردوئے معلی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور جو لفظ قلعہ معلی کی چار دیواری سے نکلا وہ اردو علم ادب کے لئے سند ہوا۔ بہادر شاہ کی شاعری میں خصوصیت سے وہ بات ہے۔ جو دہلی کے لئے سرمایۂ ناز ہے یعنی جذبات کا اظہار عام زبان میں۔ اسی وجہ سے ظفر کے کلام میں اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ذوق کی شاعری کو جس خصوصیت نے چار چاند لگا دیئے۔ وہ ظفر کے کلام میں موجود ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ بہادر شاہ مظلوم مرحوم کے واقعات پر اچھی طرح بحث کرتے اور معزول بادشاہ کے مصائب کا ذکر کر کے ایک مختصر سوانحعمری کا کام لیتے لیکن اردو علم ادب کے ایک

وقیع رسالہ کے واسطے ایسے تذکرے ناظرین کی عیش پسند طبیعت منغض کردیتے۔ اس لئے ہم نے محض ادبی تعلقات کے بیان پر اکتفا کی حق تو یہ ہے کہ باوجود تمام اشغالِ امورِ سلطنت کے بہادر شاہ کا شعر کہنا اور پھر ایسا کہنا جو مطبوع عام ہو۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے۔

ہند کی رعایا اکبر بادشاہ سے اس بات پر خوش ہے کہ اس نے اپنا مذہب رعایا کی نذر کر دیا تھا۔ اور اس کو بعض علما نے اس بے نفسی پیدہ ہر یہ سمجھ رکھا تھا لیکن بہادر شاہ نے اس سے بھی بڑھکر کام کیا۔ وہ یہ کہ اپنی مادری زبان رعایا کی نذر کر دی اور انہیں کی زبان میں اُن سے بات چیت کرنے کا سبق ہم کو سکھا گئے۔ یہ ظفر کا فیض سلطنت ہے کہ آج تمام مسلمان جن کی مادری زبان فارسی، عربی، پشتو، تھی۔ بے تکلف اردو بولتے ہیں۔ اور ان کی مادری زبان بھی اُردو بن گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو کی بنیاد شاہجہاں کے وقت سے پڑچکی تھی لیکن اس کی تکمیل بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوئی۔ گویا زبان اردو کا آخری قاصد بہادر شاہ مرحوم تھا جس کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور اس کے بعد کسی اوتار کے جنم لینے کی ضرورت نہ رہی۔

گویا دہلی کا پایہ تخت اردو کی تکمیل کی غرض سے قایم ہوا تھا۔ جس کو بوجوہ احسن اس نے انجام دیا۔

دہلی کی سلطنت نہیں برباد ہوئی۔ دنیا سے اردو کی بادشاہت اٹھ گئی۔ جب تک دنیا میں اردو کا نام ہے دہلی کی سلطنت کا چراغ روشن ہے۔ لکھنؤ نے جس قدر وقعت حاصل کی اسی دہلی سے۔ دہلی کے مایۂ ناز شاعر تباہ ہو کر لکھنؤ میں آئے اور لکھنؤ کو باعتبار زبان دانی دہلی بنا دیا۔ بقولِ غالبؔ ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میرؔ مرحوم تک قدردانی کا دائرہ محدود نہ تھا۔ بلکہ دہلی کے تمام شعرا کی قدر و منزلت لکھنؤ کے اہلِ کمال نے اسی طرح کی۔ جب تو دہلی کے سرمایۂ ناز شاعر میرزا سوداؔ۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ میر سوزؔ۔ میر تقی۔ نواب طالب علی خاں عیشیؔ وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آرہے اور یہاں سے مرکر بھی نہ نکلے۔

بہادر شاہ کا دائرۂ سلطنت آخر میں گو بہت غیر وسیع رہ گیا تھا۔ مگر اس پر بھی اُن کو اردو

زبان کی پرورش کا خیال زمانۂ ولیعہدی سے تھا۔ دہلی کے موجودہ شعرا کو جو کہنہ مشق تھے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت لی۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ۔ برہان الدین خاں زارؔ۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ۔ حکیم عزت اللہ خاں عشقؔ۔ میاں شکیبؔ۔ میرزا عظیم عظیم میر قمرالدین منتؔ وغیرہ درباری شاعر مشہور ہوئے۔ بہادر شاہ اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے۔ مگر شاہ صاحب تھوڑے زمانے کے بعد دکن چلے گئے۔ شاہ نصیر کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ان کے بعد اگر کچھ لوگ مانتے تھے تو ذوقؔ کو مانتے تھے۔ شاہ صاحب کے جانے کے بعد ظفر نے ذوقؔ سے اصلاح لی۔ یہ امر کسی قدر غالبؔ کے خلاف طبع ہوا۔ اور اپنے قصائد میں بعض بعض موقع پر اظہار ناراضی کیا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں بعد نصیر ذوقؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور غالبؔ بیچارے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ولیعہد بہادر جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اُستاد کو ملک الشعرا' خاقانی ہند کا خطاب دیا۔

ظفر کے کلام پر اس اعتبار سے نظر کی جائے کہ اس میں محاورے کس طرح ادا کئے ہیں روزمرہ کیسا ہے۔ اثر کتنا ہے۔ زبان کس قدر مستند ہے۔ تو ان کا مثل و نظیر آپ کو نہ ملے گا۔ اس لحاظ سے کہ زبان اور محاورات کے تو یہ بادشاہ تھے جو لفظ قلعہ معلی سے نکلتا وہ شعرا کے لئے سند ہو جاتا۔ ہاں پُر شکوہ الفاظ۔ مضامین بلند۔ تراکیب فارسی۔ مصادر فارسی۔ حروف روابط فارسی سے ان کا کلام خالی تھا۔ تو اس کی ضرورت بھی اردو کی شاعری میں ایسی نہ تھی۔ اور بعض کے نزدیک تو ایسی شاعری مخل فصاحت ہے۔ ہاں مضامین بلند کی ضرور دنیا قدر کرتی ہے۔ مگر جب تک وہ الفاظ فصیح زبان میں ادا نہ ہوں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

اس پر لطف یہ ہے کہ ظفر نے مشکل زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں ان کو بھی عام محاورے اور سادہ لفظوں سے پانی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اس سے ہے غریبوں کی تسلی کہ اجل نے
مفلس کو جو مارا تو نہ زردار بھی چھوڑا

اس شعر میں یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ ردیف کتنی محاورے اور زبان میں ڈوبی ہوئی ہے۔

جا سکے گلشن تلک لاؤ کرنہ ہم بے بال و پر
ہم نے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا

بیٹھا ہے مہندی لگا کر اپنے دست و پا میں تو
آج ہے اے شوخ تجھ سے ہاتھ پائی میں مزا

پہلے شعر میں کتنی نازک بات پوشیدہ ہے یعنی بے بال و پری کا نتیجہ۔
دوسرا شعر شوخی سے لبریز ہے۔ شاعر کی چلبلی طبیعت نے ایک نئی بات پیدا کی ہے کہ جب خالی ہو اس وقت دست درازی میں مزا ہے۔ وہ مجبور سے خود مختار ہیں۔ ہاتا پائی ایک فصیح محاورہ ہے جو دست درازی کے معنی پر مستعمل ہے۔

نہیں جاتا کسی سے وہ مرض ہے جو نصیبوں کا
نہ قائل ہوں دوا کا میں نہ قائل ہوں طبیبوں کا

نصیبوں کا مرض یعنی قسمت کی لکھی ہوئی بیماری۔

دیا جو اشک نے شورابہ سرشک ہیں
تو نوشجاں اُسے ہم نے مثالِ دوغ کیا

شکوہ الفاظ قابل دید ہے۔

جواب صاف تو لاتا اگر نہ لاتا خط
لکھا نصیب کا جو نامہ بر سے کچھ نہ ہوا

کتنا صاف اور سادہ مضمون ہے۔

کیوں دھوتے ہو زخم دلِ بیتاب کا پھاہا
بھیگا ہوا چپکے گا نہ پھر آب کا پھاہا
وہ زخمیِ شمشیرِ حوادث ہوں کہ جس کو آئے ہے نظر چرخ بھی زہراب کا پھاہا
پُر درد کو تزئیں سے غرض کیا کہ سرِ زخم یکساں ہے گزی کا کہ ہو کمخواب کا پھاہا
پھوڑا سا نہ دل پھوٹ بہے کیوں ظفر اسیر
ہے مرہم غمخواریِ احباب کا پھاہا

ایسی مشکل ردیف میں ظفر کے بعد دہلی میں کسی نے اس زمین میں قافیہ پیمائی نہیں کی۔
مضمون آفرینی اور شکوہ الفاظ قابل دید ہے۔

کچھ جواب اُس نے جو خط کا دیا اُلٹا سیدھا
نامہ بر نے مرے رستہ لیا گھر کا سیدھا

اصل لفظ تو راستہ ہے مگر رستہ اردو میں زیادہ فصیح ہے۔ گھر کا سیدھا رستہ لیا۔ محاورہ ہے جو اس جگہ بہت موقع سے صرف ہوا ہے حقیقت میں کلام الملوک ملوک الکلام ہے۔ ظفر کی

زبان فیض ترجمان سے جو کچھ نکلتا ہے۔ وہ زبان کے لئے سند ہے۔

مرا گھر تو نے کیوں چھوڑا ترا گھر تھا تو اس جا تھا
مکاں پردے کا اے پردہ نشیں گر تھا تو اس جا تھا

کتنی مشکل ردیف میں تصوف کے مسئلے کو طے کیا ہے۔

وہ تھا جو مہر و مہ کے لئے اعتبار نور
سب تیرے ایک جلوہ دکھانے سے اڑ گیا

یہ بھی ایک اہل اللہ کے مذاق کا شعر ہے۔

تھا میرے اور اس کے جو پردہ سا اک ظفر
یکبارگی دوئی کے اٹھانے سے اٹھ گیا

کتنا وحدت میں ڈوبا ہوا مقطع ہے۔

بے لکھے خط جو کیا نامہ و پیغام طلب   کاہلی لکھنے کو تم آپ ہیں آرام طلب

سر نامہ میرے نام کا اور خط رقیب کا   ظالم ترے ستم کے ہیں عنوان عجب عجب

نفس کی ہے یہ جو آمد و شد لغو کر سیر اسکی غافل
یہ دیکھ طے ہو رہی ہے کیونکر رہ وجود عدم جہاں چپ

جلا کیا شب غم دل کا داغ صبح کے وقت   وگرنہ ہوتے ہیں گل سب چراغ صبح کیوقت

دل ہے مکدر اس کا صفائی ہو کس طرح   بخت اپنے نارسا ہیں رسائی ہو کس طرح

ہے سفر در پیش اس بستان سرا سے غنچہ وار   باندھ تو رخت سفر غافل سفر سے پیشتر

کرے ہے نکہت گل دمبدم چمن میں سفر   ہمیشہ خانہ بدوشوں کو ہے وطن میں سفر

کیونکر نہ خاکسار رہیں اہل کیں سے دور   دیکھو زمیں فلک سے فلک ہے زمیں سے دور

قیام ارنڈ کی جڑ سے بھی کم ہے دنیا کو   کچھ اس کی اصل نہیں ہے گر فنا کی جڑ

واللہ بتوں نے ہم سے یاری کی ترک
پر ہم نے نہ اُن کی پاسداری کی ترک

جانِ عالم ہو. کوئی کیونکر جدا رکھے تمہیں
زندگی ہے اسے بتو تمسے اِخدا رکھے تمہیں

صنم جیسا کہ تو نام خدا ہے دلربائی میں
نہوگا دلربا ایسا کوئی ساری خدائی میں

جلایا آپ ہم نے ضبط کرکے آہ سوزاں کو
جگر کو سینے کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو
ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو یاس کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو
بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو دیو کو جن کو پری کو حور و غلماں کو

بے پڑھے خط نہ مرا تیوری پہ بل ڈالو
پہلے پڑھ لو اُسے پھر پھاڑ کے ال دل ڈالو

دل و جاں دین و ایماں ہے جو لینا ہو صنم لیلو
کروں گا عذر دینے میں نہیں مجھ سے قسم لیلو
تم آئے عین گرمی میں نکل کر دل سے لے اسکو
کوئی دم نخلِ مژگاں کے ذرا سایہ میں دم لیلو
یہی ہے حضرت دل عشق کے بازار میں سودا
اگر لینے ہو اپنے واسطے تم مول غم لیلو
نہیں ہے اعتبار ان کا وہ ہیں کہکر مکر جاتے
نوشتے اُن کی باتوں کے ظفر تم یک قلم لیلو

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سُنو

نہیں معلوم ظفر اُن سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

کہتا ہے تم سے کون کہ خنجر بکف نہ ہو
پر حق جاں نثارِ محبت تلف نہ ہو
اللہ ہے ہمارا طرفدار اے ظفر
کوئی اگر نہیں ہے ہماری طرف نہ ہو

ہے جہاں میں خواہش نام و نشاں بے فائدہ
سینہ کاوی ہے نگیں کی طرح یاں سب بے فائدہ

واں رسائی نہیں تو پھر کیا ہے
یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہے
ہو ملاقات تو صفائی سے
اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے

بے حجابی نہیں تو پھر کیا ہے ۔ بگیں قاب اغنیا ہونا

اللہ اللہ رے بتوں کا غرور
یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے ۔ بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے

ہشیار رہنا چاہئے یاروں سے اے ظفر
ہیں یار اس زمانے کے عیار بن گئے

سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی ۔ کس کی ابرو کی وہاں تصویر کھنچ کر رہ گئی

لوگ اس مطلع کو بہادر شاہ کی کرامات پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس مطلع کے چند روز بعد خبر آئی تھی کہ بھوپال میں تلوار چل گئی ۔ اور بہت کچھ کشت و خون ہوا ۔

میرے حق میں تو مری تقدیر دشمن بن گئی ۔ کیا عزو و بدخواہ کیا تدبیر دشمن بن گئی

غذا پر بھی انساں توکل کرے ۔ خرد ہی یہ تکیہ نہ بالکل کرے

کروں کم نگاہی کا گر میں گلہ
تو پھر اور بھی وہ تغافل کرے

کھوئی ہم نے آپ اپنی بات اپنے ہاتھ سے ۔ لکھ کے حال اپنا انہیں ہیہات اپنے ہاتھ سے

بلاکش اور غارتگر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے ۔ جفاکش اور ستم پرور نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

کہ گل تمام گلستاں میں کھل کھلا کے ہنسے ۔ عجب روش سے انہیں ہم گلے لگا کے ہنسے

یہ کہدو غنچے سے آتی ہے تیرے منہ سے بو
چمن میں سامنے اس گل کے منہ چھپا کے ہنسے

غنچے کا منہ ہے کیا کہ جو پھر اے صبا ہنسے ۔ گلشن میں جب ادا سے وہ رنگیں ادا ہنسے

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے حال دل
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

بعید اے عشق ہے یہ بات انصاف و عدالت سے ۔ لے خوسرد کو شیریں کو کہن ناکام رہ جائے

علمی استعداد نے انکو روسائے شہر کی نظر میں معزز بنا رکھا تھا۔ بعد انتقال میر نفیس جناب راجہ علی محمد خاں بہادر بالقابہ والیِ محمود آباد آپکے شاگرد ہوئے اور ایکسو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ سواری کیواسطے بگھی مرحمت ہوئی۔ حاضری اور پابندی اوقات معاف تھی سالہا سال جب راجہ صاحب لکھنؤ میں ہوتے تھے تو آپ روزانہ ملاقات کو تشریف لیجاتے تھے۔ حد کے خلیق اور ملنسار تھے جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا تھا مشاعروں کی شرکت کم کر دی تھی مگر خاص خاص مشاعروں میں مجبوراً شریک ہوتے تھے۔

چنانچہ جناب حامد علی خاں بیرسٹر نے جو عظیم الشان مشاعرہ کیا تھا اسمیں آپ بھی تشریف لائے تھے اور تا اختتام مشاعرہ میں شریک رہے۔

آپ کی سات اولادیں ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے سید ظفر حسن صاحب فائق۔ دوسرے سید ہادی حسن صاحب لائق تیسرے سید یوسف حسن صاحب اور چار لڑکیاں ہیں۔

۱۴۔ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۳ھ وقت سحر میر نفیس مرحوم کی مجلس فاتحہ خوانی میں مرثیہ پڑھنے بگھی پر سوار ہو کر سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج کے مکان پر جا رہے تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ (نیا ادرے کے قریب) پہنچکر دفعتاً قلب میں شدید درد اٹھا بگھی رکوا کر اعزا نے مکان پر واپس لانا چاہا۔ کٹرہ حیدر حسن خاں میں پہنچکر حالت زبان متغیر ہوئی۔ مجبوراً ایک حکیم صاحب کے مطب میں (جو وہیں واقع تھا) لیجا کر لٹا دیا ابھی فکر علاج میں تھے کہ روح پرواز کر گئی۔ اسکے بعد میت گھر میں لائی گئی۔ ان کی عمر صرف ستاون برس کی تھی۔ نہایت قوی الجثہ تھے آپ کی وفات سے تمام شہر میں تہلکہ پڑ گیا۔ مرحوم میں اخلاقی خوبیاں بہت تھیں۔

انتخابِ کلام

رباعیات

بیٹا ہوتا نظم پہ موقوف نہیں　　نالہ اپنا اثر پہ موقوف نہیں
ممکن ہے شباب میں بھی غم پیری کا　　ٹھنڈی آہیں سحر پہ موقوف نہیں

ایضاً

پیری اسبابِ زیست سب لوٹ چکی　　اک آس جوانی کی جو تھی ٹوٹ چکی
کہتے ہیں زبانِ حال سے موئے سفید　　اب رات کہاں رہی کرن پھوٹ چکی

ایضاً

ہم وہ ہیں نہ وہ شباب کی باتیں ہیں　　کچھ ہیں بھی تو انقلاب کی باتیں ہیں
پیری میں جوانی کا بیاں اے عارف　　کچھ ہوش میں آ، خواب کی باتیں ہیں

در شان باری

ذرے میں ضیا مہر کی پیدا کر دے   ادنیٰ کو وقار دے کے اعلیٰ کر دے
کچھ وسعت رحمت کی نہیں حد یارب   تو چاہے تو اک قطرے کو دریا کر دے

تفاخر شاعرانہ

محفل میں جہاں کے سخنور مجھ سے   مخفی نہیں ہر کسی کے جوہر مجھ سے
چھانے گا اگر خاک زمانہ برسوں   ذرے آئیں گے ہاتھ کمتر مجھ سے

انتخاب سلام

جو دور اندیش ہیں دنیا میں کب وہ گھر بناتے ہیں   مکان مداح سرور خلد میں جاکر بناتے ہیں
عمارت کس لئے دنیا میں اہل زر بناتے ہیں   جو عاقل ہیں سرائیں بھی کہیں وہ گھر بناتے ہیں
رقعا بچوں نے جب مانگی تو زینب سے کہا شہ نے   غضب کی اب تو باتیں یہ مہ انور بناتے ہیں
جنہیں عقل سلیم اللہ نے دی ہے زمانے میں   دل دشمن میں بھی وہ دوستی سے گھر بناتے ہیں
غم شہ میں کوئی آنسو جو لب تک آ گیا ڈھل کے   کہا تسنیم سے آنکھوں نے یوں کوثر بناتے ہیں
ٹپک پڑتے ہیں آنسو یاد کر کے حال عابد کا   لرز جاتے ہیں جب زنجیر آہنگر بناتے ہیں
نجف کے میکدے کی آرزو میں مر کے بھی دیکھیں   ہماری خاک سے کب کاسہ گر ساغر بناتے ہیں
بہت بیتاب ہے تیغ مرتضےٰ رن میں چلنے کو   مگر شبیر ابھی قبر علی اصغر بناتے ہیں
صدا یہ صاف آتی ہے مزار تہائے عالی سے   خطا کرتے ہیں راہ سیل میں جو گھر بناتے ہیں
سر شاک خوں غم سرور میں ٹپکاتے ہیں آنکھوں سے   ہم ان قطروں سے بخشش کیلئے محضر بناتے ہیں
سخن کے جوہری جو ہیں دکھیا دو انکو اے عارف   بھلا کہتے ہیں اس کو اور ہیں گوہر بناتے ہیں

گھوڑے کی تعریف

کیوں قدر کریں اسکی نہ عباس خوش انجام   مثل اس کا نہیں بجز یہیں دم سے تا شام
جانمار بھی آفت کا ہے یہ اسپ سبک گام   ہوا و ج کہ پستی کہیں دم بھر نہیں آرام
شعلے بھی دھنا کرتے ہیں سر اسکی لپک پر   سیماب زمیں پر ہے تو بجلی ہے فلک پر

تلوار کی تعریف

اس تیغ سر افراز پہ پیار آئے نہ کیونکر   ڈوبی ہوئی ہے حسن کے دریا میں سراسر
شفاف چمکتا ہوا آئینہ سا پیکر   یہ حور کی الجھی ہوئی زلفیں ہیں کہ جوہر
ہے فرق اگر کچھ تو لبقا رسم مو ہے   ان کے لئے روغن کی جگہ خون عدو ہے

ساقی نامہ

ہاں ساقی مہرو کوئی جام آج پلا پھر — میں جبکہ ہوں مشتاق وہ دے شیشے سے لا پھر
دے آئینۂ طبع مصفا کو جلا پھر — ہونٹوں سے چھلکتے ہوئے ساغر کو لگا پھر
لکھتا ہوں دعا ساقیِ کوثر کے خلف کی
جھوٹی بھی اگر مے ہو تو رندانِ نجف کی

انتخاب غزلیات

نہیں ہے سرخ دوپٹا یہ فرقِ دلبر پر — چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا سر پر
ہوا کی طرح سے پٹتا ہے لیکے اُس سے جواب — نظر نہ پیار سے کیوں کر کروں کبوتر پر
وہ روز وعدے کو دانستہ بھول جاتے ہیں — بدی کی رکھنے کو تہمت مرے مقدر پر
رواں ہوا صفتِ ماہ صبحِ وصل وہ مہر — شکن کی طرح پڑا رہ گیا میں بستر پر
خلاف وضع ہے گر غیر کو کروں سجدہ — جبین رکھ کے ترے آستانۂ در پر
ادا سے دیکھتے ہیں جب وہ خاکساروں کو — تو اور ہوتی ہے صیقل نگہ کے خنجر پر
وصال و ہجر کا ساماں بہم رہے اے دل — گلوں کا فرش ہو کانٹوں سمیت بستر پر
نئی خوشی ہے کہ قاتل لقب ہو عالم میں — کبھو تو ہاتھ بھی رکھا نہ جائے خنجر پر
وہ جلد آئینگے یا دیر میں خدا جانے — میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر
بغیر اذن کسی کو مجال دخل نہیں — ہوا بھی جاکے ٹھہر جاتی ہے ترے در پر
سمجھتے ہیں کہ انہیں اب کوئی نہ توڑے گا — بخیل کرتے ہیں مہریں جو کیسۂ زر پر
فروغ نور کا حاصل ترے قدم سے کرے — پڑا اسے سایۂ دیوار اس لئے در پر
جو ناشناس جتاتے وہ سمجھے خندۂ برق — ہنسی فلک کو جو آئی مرے مقدر پر
زمانہ ٹھوکریں کھلوا اسکے اوج دیتا ہے — اٹھی جو گرد قدم سے تو آتی ہے سر پر
میں نار ہوں مرا دفن و کفن ہے کیا دشوار
ذرا سی خاک کی چٹکی چھڑک دو بستر پر

ہے حجاب پینے میں یکتا ادائے دلبر بھی
لگا نہ دے کوئی تہمت کہیں قضا پر بھی

نہ میرے زخموں کو کہیے ذرا دریدہ دہن
حضور تیز زباں آپ کا ہے خنجر بھی

کبھی شکار کیا خود کبھی شکار ہوئی
مری نگاہ ہے شہباز بھی کبوتر بھی

عجب طرح کی کشاکش ہے دل کسے یارب
ادا بھی دل کی ہے طالب نگاہ دلبر بھی

مثالِ نکہتِ گل راز ہے محبت کا
کہ میرے دل میں بھی ہے اور دل کے باہر بھی

مرے لہو کے مزے کے رہیں گے مشتاق
زبان تیغ کو چاٹا کریں گے پتھر بھی

کھلی ہے آنکھ جو مجھ نیم جاں کی صبح فراق
لپٹ کے ہوتا ہے مجھ سے وداع بستر بھی

حسرتِ ہجر نہ ارمانِ وصال اچھا ہے
جس سے بہلا رہے دل کچھ وہ خیال اچھا ہے

کچھ بقا جس کو جہاں میں ہو وہ حال اچھا ہے
جو کبھی جائے نہ سر سے وہ خیال اچھا ہے

طلب وصل پہ دیتے جو نہیں کچھ وہ جواب
ہم سمجھتے ہیں کہ انجام سوال اچھا ہے

تم نہ صورت مری دیکھو نہ مرا ذکر سنو
نہ میں اچھا ہوں نہ ایجاں مرا حال اچھا ہے

صبح رخ نے اسے کافور کی ٹھنڈک بخشی
اب دلِ سوختۂ برق جمال اچھا ہے

ہو ہی جاتی ہے برا حسن کے توجہ ان کو
رشک کی جا ہے کہ مجھ سے مرا حال اچھا ہے

ذکر سودائیوں کا بزم میں آ جاتا ہے جب
کہتے ہیں عارفِ آشفتہ خیال اچھا ہے

منیر مرحوم

سید محمد اسمعیل حسین منیر مرحوم ابن سید احمد حسین شاد مرحوم شکوہ آباد کے رہنے والے تھے خود لکھتے ہیں کہ مجھے شاعری کا شوق عنفوان شباب سے تھا لیلی سخن پر مجنون تھا۔ رات دن اشعار دیکھا کرتا تھا۔ اور خط کے ذریعہ سے استاد ناسخ سے اپنے کلام پر اکثر اصلاح لی۔

پھر ایسا ہوا کہ نواب نظام الدولہ خلف اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر کی ملازمت حاصل ہوئی اور روزمرہ مصاحبین میں داخل ہوکر کانپور میں آیا۔ اس وقت حضرت مجتہد الشعرا ناسخ کی آستانہ بوسی حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ استاد مرحوم کسی تقریب سے نواب امین الدولہ بہادر کے مہمان تھے۔ اور بہت فوائد حاصل ہوئے اور جب ناسخ مرحوم لکھنؤ تشریف لے گئے۔ تو اس دن سے حسب ارشاد عالی ناچیز جناب میر علی اوسط رشک کے شاگردوں میں داخل ہوا اور ان کی خوشہ چینی کی برکت سے کانپور۔ لکھنؤ۔ مرشد آباد اور دوسرے شہروں کے مشاعروں میں شریک ہوا۔

آخر طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہوکر بیت السلطنت لکھنؤ میں آیا۔ اور برسوں یہاں مصیبت جھیلتا رہا۔ تکلیف اٹھاتا رہا۔ توفیق باری نے دستگیری کی اور ظہیر الدولہ نواب علی اصغر خاں بہادر کی خدمت میں پہنچا۔ اس عالی ہمت نے مرہم اطمینان معاش کا دل ریش پر رکھا۔ تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ نواب معین الدولہ سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ بہادر کے التفات نے قرض کے بار گران سے مجھے سبکدوش کرکے کانپور میں بلالیا۔ اور اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دی۔ ابھی دم نہیں لینے پایا تھا کہ پھر دشمنوں کی دشمنی سے مجھے روز سیاہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اور ایک سخت بلا میں مبتلا ہوا۔ اگر ایسے وقت میں مولانا احمد حسن خاں بہادر عرف صبر گداز اعانت نفرماتے تو میرے وجود کا غبار بھی صحرائے عدم میں پہنچ جاتا۔ اور اسی حال میں امیر دانا، فیاض بے ہمتا، شاعر شیریں مقال اسد الدولہ رستم الملک سید محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر ذکی تخلص نے اپنے متوسلین میں داخل کرکے اصلاح کلام کی خدمت میرے سپرد کرکے رہین منت بنایا اور دوبارہ مجھے لکھنؤ میں

بلایا۔ اور کوئی دقیقہ فروگذاشت اور توقیر میں باقی نہ رکھا۔ دو برس تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا کہ رئیس الامرا امیر الاغنیا گوہر دربارے سخنگوئی نواب نصیر الدولہ معین الملک محمد حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ فرمانروائے ریاست فرخ آباد نے میری بیکاری اور بیچارگی کا حال معلوم کرکے مجھے طلب کیا۔ اور سفر خرچ بھی بھیجدیا۔

آخر لکھنؤ کی مفارقت کا داغ لیکر فرخ آباد میں قیام کیا۔ نواب کی ملازمت میں (خدا انکی مغفرت کرے) میں بہت مالدار ہوگیا۔ ذرے کو آفتاب بنادیا۔ آخر نواب مبرور نے انتقال فرمایا۔ اور کچھ دنوں ان کے مرنے کے بعد میں نے مصیبت جھیلی۔ ہر چند اس وقت بھی مہاراجہ الور فرمانروائے دھولپور نے بہت سے شقے لکھکر مجھے طلب فرمایا۔ اور زر مصارف بھی روانہ فرمایا۔ لیکن دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ ایسے غیر معروف دور دراز ملک میں جاکر بقیہ عمر تلف کروں۔ اس کے علاوہ شفیق والاہمم لالہ مادھو رام جوہر (جو میرے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں) کی محبت بھی اجازت نہ دیتی تھی۔

ناگہاں دولت بیدار نے منہ دکھایا یعنی امیر الامرا رئیس الروسا حضرت ولی نعمی نواب علی بہادر صدر نشین حکومت "باندا" نے اپنی قدردانی کی کمند سے فرخ آباد سے "باندے" میں کھینچ لیا۔ اور وابستگان دامن دولت میں شامل کرلیا۔ اور اپنے کلام کی اصلاح سے میری عزت افزائی کی۔ ابھی تک یہی بادہ جام میں اور یہی ہما دام میں ہے۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ ایسے ایسے انقلابات عظیم واقع ہوئے کہ کبھی مشرق میں تھا تو کبھی مغرب میں۔ ایک دم بھی آرام سے بیٹھنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں تحصیل علوم اور فکر شعر جس کے لئے پوری آسودگی درکار ہے کیا ہوسکتی تھی۔ مگر اس پر بھی میں نے بہت کچھ لکھا کہ اگر وہ سب کلام جمع ہوتا اور تلف نہ ہوتا تو چھ سات دیوان مکمل ہوجاتے۔ فی الحال دو دیوان جمع ہوئے، پہلے میں استعارات اور کنایات نظم ہیں دوسرے میں استعارے نہیں مگر نزاکت معنی سے خالی نہیں ہے۔ اور اگرچہ بعض شعرا کی تعلیاں اجازت لب کھولنے کی نہیں دیتی ہیں لیکن جو نالہ لب تک آتا ہے۔ وہ کب رکتا ہے۔ لہذا بے کم و کاست لکھتا ہوں کہ آج کل کے ابنائے زماں خصوصاً شعرا اکثر علم و فضل و کمال سے خالی ہیں۔ یہاں تک کہ رسم الخط سے بھی ناواقف اور عروض و قافیہ کو اسم بے مسمیٰ جانتے ہیں۔ اس سبب سے کہ انہوں نے استعداد تحصیل علم کی ترک کردی۔ اور بعضوں نے چند انشا کی کتابیں طفولیت میں پڑھی تھیں۔ وہ اب ان پر ناز کرتے ہیں۔ اور کریمہ لحن الملکی بجاتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں طاقت شعر فہمی کی نہیں

رکھتے۔ دوسرے دقائق سخن تو جاننا مشکل ہیں۔ اور سننے والے ایسے اہل فہم ہیں کہ ان لوگوں کے ہاتھ سے ہزار ہا نشتر دل پر لگتے ہیں۔ لہذا ان لوگوں کی قابلیت کے خیال سے سہل گوئی اختیار کی۔ منیر مرحوم نے جو حال اپنا آپ لکھا ہے وہ سب غدر کے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے۔

غدر کے بعد بھی کسی الزام میں قید ہو کر کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ فرخ آباد کے احباب گردش تقدیر سے چھوٹ گئے۔ ہم قید ہو کر "باندے" میں آئے۔ وزیر خاں ہمارا ایک شاگرد تھا۔ اس نے بہت سعادتمندی کی۔ آخر میری تقدیر سے عاجز ہو گیا۔ اور بھی دوستوں نے رہائی کی تدبیر کی۔ مگر کارگر نہ ہوئی۔ الزام یہ تھا کہ مسماۃ نواب جان قتل کی گئی مصطفے بیگ نے اسے قتل کیا اور تزویر سے مجھ بیگناہ کو بھی پھنسوا دیا۔ باندے کے زنداں میں مجھ پر لاکھوں ستم ہوئے۔ ایک تاریک کوٹھری قبر کے مانند جس میں بول و براز کا ڈھیر تھا۔ پانی کا قطرہ میسر نہ ہوتا تھا۔ اینٹوں کا میسر نہ آتی۔ اس کی سخت تکلیف ہوئی۔ ہر وقت گالیاں کھاتے تھے۔ روٹیاں گو بہ جیسی کھانے کو ملتی تھیں۔ ترکاری کے بدلے سوکھی گھانس بھینس کی سانی سے بدتر دال کر کری تکلیف بے نمک۔ ٹاٹ کا بچھونا کمل اوڑھنا محنت مزدوری۔ تکلیف حد بیان سے باہر اہلِ جہنم کے نام ہو کل بے مروت بے حیا۔ قابلِ اشراف تھے۔ پھر ہم کو الہ آباد میں بھجوا دیا۔ الہ آباد میں جو ستم گزرے وہ بیان سے باہر ہیں پھر وہاں سے کلکتہ پیدل روانہ ہوئے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ راستے میں اعدا نے بہت ستم کئے۔ کلکتہ میں فوٹو اتارا گیا اور ہم کالے پانی بھیجدیئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۲۷۷ھ کا ہے۔ کالے پانی سے شاگردوں کی شکایت اور بیمروتی کی حالت میں لکھتے ہیں۔ جب تک میں ہندوستان میں رہا سب شاگرد میرے ثنا خواں تھے۔ وہاں سے قید ہو کر کالے پانی میں آیا تو اکثر شاگردوں کے خطوط آیا کئے۔ عزیزوں کی شکایت کیا کروں ان سے میں خود شرمندہ ہوں۔ اگر میں نے کوئی سلوک کیا ہوتا تو ان سے ہمدردی کی امید رکھتا مگر ان شاگردوں سے شکوہ ہے جنہوں نے یک قلم بھلا دیا۔ نواب باندا کی شکایت بے سود ہے کیونکہ وہ میرے آنا جانے میں ملازم تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس فتنے نے ان کو بھی تاراج کر دیا تھا لیکن اگر کوئی شقہ بھیجدیتے تو مجھ کو اتنا رنج نہ ہوتا۔ صرف واجد علی خاں میرے حقوق تربیت کو نہ بھولے اور اس بد نصیبی میں بھی پاؤں سے پیش آئے۔ نواب حیدر جنگ نے بھی ان کی سعی سے احسان کیا۔ سید الدین نے بھی سعادتمندی کی کہ عزیز شکستہ دل کو پانچ سو روپے بھیجے اور اعانت کی تسلیم کے زاد راہ کا سامان کر دیا تھا۔ ۱۲۸۲ھ

ہیں قید سے رہا ہو کر ہندوستان میں آئے کہتے ہیں۔
جزیرہ دریائے شور میں ہم قید تھے۔ وہاں کمشنر صاحب کے محکمے میں منشی تھے۔ انعام میں
دو برس معاف ہوئے۔ چھٹکر الہ آباد آئے۔ وہاں سے کانپور پہنچے۔

منیر نے مرثیہ پر مرزا دبیر سے اصلاح لی۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں بعد رہائی ملازم ہوئے۔ ان کی سرکار میں بہت سرفرازی پائی۔ نواب رامپور بہت قدردان رئیس تھے اسیر۔ امیر۔ عروج۔ داغ۔ جلال۔ حیا۔ شاغل۔ تعشق۔ بحر۔ جان صاحب۔ بدر۔ شاد۔ آں غنی۔ اور اچھے اچھے شاعران کی فیاضیوں سے جمع ہو گئے تھے۔ منیر بہت پرگو تھے۔ ان کا کلیات مطبع ثمر ہند لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر نے اپنے خاص مصارف سے چھپوایا تھا۔ اس میں تین دیوان ہیں۔ پہلا منتخب العالم۔ دوسرا تنویر الاشعار۔ تیسرا نظم منیر۔ ایک مثنوی معراج المضامین بھی منیر نے لکھی تھی جو اب طبع ہوئی ہے۔ اس میں معجزات امام لکھے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۲۹۲ھ میں چھپا تھا۔ اس وقت تک منیر زندہ تھے۔

غدر سے پہلے نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور کی خدمت میں بھی کچھ قصاید منیر نے بھیجے تھے اس وقت تک نواب یوسف علی خاں بہادر ولیعہد تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں کہ حضور نے مجھے طلب فرمایا۔ شقہ طلبی بھیجا اور زادِ راہ بھی عنایت ہوا۔ مگر میں حاضری سے معذور ہوں۔ آج کل ایک سخت حادثہ پیش آیا ہے ناچار عطیہ سرکار واپس کرتا ہوں۔ مجھے بعد محرم یاد فرمائیے اور اسی وقت زادِ راہ بھی مرحمت ہو۔ مقطع میں لکھتے ہیں ؎

دربار میں منیر غزل خوانیاں کریں
طوطی حضور سول لیں یہ بولتا ہوا

منیر قادر الکلام تھے۔ اور نظم کے کسی صنف میں عاجز نہ تھے۔ خاصکر قصائد کے بادشاہ تھے۔ قطعہ۔ رباعی۔ فرد۔ مخمس۔ غزل۔ فارسی۔ اردو سب میں اپنا رنگ دکھا جاتے تھے اور ہمیشہ رئیسوں کی صحبت میں رہے۔ علم مجلس سے خوب واقف تھے۔ مگر ایک جگہ قیام کم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے سفر کیے۔ آخر میں رامپور میں عمر بسر کر دی اور اسی رئیس کی ملازمت کے سلسلہ میں انتقال کیا۔

انتخاب کلام

سرِ تاجِ روح نام ہے ربِ کریم کا — چوٹی عروسِ جاں کی ہے دنبالہ میم کا
بندہ ہوں اے منیر خدائے کریم کا — صراف ہوں خزانۂ فیضِ عمیم کا
ہر سر کے واسطے نہیں سودائے عشقِ پاک — جبریل کا دماغ ہے گھر اس شمیم کا

امید ہے خدا سے کہ قبل از اجل منیر
دیکھے مزارِ نفس رسول کریم کا

بختِ خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں نہ تھا — خوابِ غفلت کا گذر چشمِ نگہباں میں نہ تھا
تجھے سے بھی دنیا میں مشتاق عروسانِ بہشت — اسکے سر سہرا رہا جو فکر ساماں میں نہ تھا
ہوگئے محجوب تم کو دیکھکر خوبانِ دہر — کونسا سر تھا جو آغوشِ گریباں میں نہ تھا
میرے رونے کی خبر کیوں کر نہ پوچھی نوح سے — سات دریا درمیاں وہ عینِ طوفاں میں نہ تھا
ہر گھڑی کے رنج سے اک بار تو ملتی نجات — زہر بھی میرے لئے تلخیِ دوراں میں نہ تھا
لطف کی صحبت نہ دیکھی زندگی بھر اے اجل — مجمعِ دلچسپ اس خوابِ پریشاں میں نہ تھا
منہ جو پردے سے نکالا ہو گیا بے شرم حسن — شعلۂ عریاں چراغِ زیرِ داماں میں نہ تھا
وحشیانِ عشق کو کیوں کر پسند آتا بہشت — اک گلِ داغِ جنوں گلزارِ رضواں میں نہ تھا
مفت بھی رکھے نہ اک بت نے یہ موتی اپنے پاس — آنسوؤں کا آب و دانہ شہرِ خوباں میں نہ تھا
ایک رسی عاشق و معشوق کی گردن میں تھی — اے جنوں کس کا گلا طوقِ گریباں میں نہ تھا
فصلِ گل میں علم تھا دربارِ سلطانِ جنوں — راندۂ درگاہ تھا جو آپ کی زنداں میں نہ تھا
صوفیانہ وضع تھی جب کشتگانِ عشق کی — لالۂ خونیں کفن باغِ شہیداں میں نہ تھا
ہم سے کرتی ہے قیامت چال کس امید پر — کونسا فتنہ نیا رفتارِ خوباں میں نہ تھا
بحرِ آفت میں تنِ لاغر بھی تھا ناآشنا — ایک تنکے کا سہارا جوشِ طوفاں میں نہ تھا
بلبلوں کے حق میں اب صیاد کانٹے بوتے ہیں — یاد آیا میکدہ تھا اس گلستاں میں نہ تھا
ہم سے پہلے خلوتِ اہلِ عدم تھے بے فروغ — اک چراغِ مردہ بھی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

راہ و رسمِ خانۂ زنجیر کس سے پوچھتے
کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا

کعبے کے سامنے دلِ خانہ خراب تھا　　یہ جھوپڑا حضورِ محل کا جواب تھا
دنیا و دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے　　یا دشمن بخیر وہ دل خانہ خراب تھا

اللہ رے تلوّنِ نیسانِ فیضِ دوست
اشکِ یتیم تھا کہیں دُرِّ خوشاب تھا

کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا　　دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن اُنکا
کس طرح پائیں پتہ شیخ و برہمن اُن کا　　سارے ہرجائیوں کے دل میں ہے مسکن اُنکا
نہیں دبنے کا جوانی سے لڑکپن اُن کا　　چھاتی پر چڑھ کے دبایا کرے جوبن اُنکا
جھجکے غیروں سے مرے خواب میں وہ آئینگے　　راستا روک کے بیٹھے رہیں رہزن اُنکا
جائے انصاف ہے دم کیوں نہ گلے میں اٹکے　　لے اجل گھر ہے قریبِ رگِ گردن اُنکا
کیا ہوا خاک نشینوں نے اگر دیکھ لیا　　اس قدر جامے سے باہر نہ ہو دامن اُنکا
بے حقیقت بھی نہیں فیضِ ازل سے محروم　　نظر آیا دلِ ہر مور میں خرمن اُنکا
ایسے منکر سے کہو ارض و سما میں نہ رہے　　ڈھونڈھ لے اور خدائی کہیں دشمن اُنکا
شمعِ رُخ سے نہ چراغِ حرم و دیر جلائیں　　جلوہ پہچان نہ لیں شیخ و برہمن اُنکا
وصل نے لوٹ لیا دونوں کو تنہا پاکر　　آج میرا ہے گریبان نہ دامن اُنکا
جلوۂ داغِ محبت میں کمی تھی جن کے　　جھلملاتا ہے چراغِ سرِ مدفن اُنکا
سابق و حال کے جلوے کو مطابق کرلیں　　آئینہ بھیجدے اے وادیِ ایمن اُنکا
کل ہی کی وعدہ خلافی سے وہ محجوب نہیں　　کئی شب کا ہے ہلالِ خمِ گردن اُنکا
آپ سے آپ سسک جاتی ہے انگیا کرتی　　پھٹ پڑا دیکھتے ہی دیکھتے جوبن اُنکا

ناسخ و رشک کا یہ نور افادت ہے منیر
تا ابد نام زمانے میں ہے روشن اُن کا

دستِ جفائے یار نہ دل کھول کر ملا　　دامانِ زخم بھی جو ملا ہاتھ بھر ملا
بزمِ جہاں میں گرمِ فغاں ہر بشر ملا　　خاموش اگر ملا تو چراغِ سحر ملا
غصے کے وقت ان کو کبوتر نے خط دیا　　قاصد بھی قسمتوں سے عجب جانور ملا
دنیا سے لاکے چھوڑ گئی موت قبر میں　　جس گھر میں بیکسی ہے مقید وہ گھر ملا
نقصان کا عوض ہو زمانے میں کس طرح　　جو دن گذر گیا نہ کبھی عمر بھر ملا

دانا بھی مول لے نہیں سکتے ہیں لے منیر
افسوس ہے کہ کیوں ہمیں یکتا گہر ملا

اپنے رتبے سے جو منظور ہے بڑھکر ہونا　　اے قیامت قدم یار کی ٹھوکر ہونا
دشمن جاں ہے فقیروں کو تونگر ہونا　　لے اُڑا سوئے عدم چونٹیوں کو پر ہونا
منعمو خاک نشینوں سے تعلی کب تک　　ایک دن ارض وسما کو ہے برابر ہونا
دیکھنے والوں نے بے پردہ تمہیں دیکھ لیا　　پھر بھی غصے میں کبھی جامے سے باہر ہونا
ہر جگہ سختی و نرمی نہیں زیبا اے دل　　شیشہ میخانے میں بتخانے میں پتھر ہونا
جی کے مرنے سے تو بہتر تھی بقا بعد فنا　　خوب تھا ہو کے نہ ہونے سے نہ ہو کر ہونا
قتل کرنے کے لئے وعدۂ فردا کیا　　ابھی ہو جائے اگر ہو کوئی محشر ہونا
ایک تم بھینچے میں سب سے نکیلے نکلے　　نہیں آتا ہے کسی پھانس کو نشتر ہونا
بندہ عاجز نہ ہو تدبیر کے یہ معنی ہیں　　اپنی تقدیر سے بھی چاہئے بڑھکر ہونا
چار دن روح کو تکیہ ہے بدن پر ناحق　　صاحب خانہ کی قسمت میں ہو بے گھر ہونا
دین و دنیا کے مزے سے رہے محروم لبیل　　خضر ہونا ہمیں آیا نہ سکندر ہونا
ذبح کر ڈالئے پر سب میں نہ گنئے ہم کو　　سر سے درگذرے گوارا نہیں ہمسر ہونا
حسن و خوبی کی ترازو سے ہے دوپٹہ تیرا　　دونوں پلوں کو مناسب ہے برابر ہونا

حضرت رشک کے بھی لیں گے قدم چل کے منیر
کربلا میں کئی رتبے ہیں میسر ہونا

عبث کہتے ہو کوئی ہم سا نہ ہوگا　　خدا کی خدائی میں کیا کیا نہ ہوگا
مرے ہوں گے سر پھوڑ کر مرنے والے　　تمہارا تو ماتھا بھی ٹھنکا نہ ہوگا
کہاں سے لگائیں گے مہندی پری رو　　اگر روز خون تمنا نہ ہوگا
کدورت اگر دل میں یونہیں رہیگی　　کہاں تک یہ آئینہ میلا نہ ہوگا
مرے رشک یوسف کو دیکھ لے زلیخا　　کبھی خواب میں تو نے دیکھا نہ ہوگا
ڈھلا ہے یہ سانچے میں دور فلک کے　　زمانہ کسی طرح سیدھا نہ ہوگا
وہ مشق ستم کر کے کامل بنیں گے　　جو لکھا ہے کس طرح پورا نہ ہوگا
تمہاری گلی سے سوئے کعبہ جاؤں　　خدا سے ڈرو مجھ سے ایسا نہ ہوگا

اٹھے گا غرور اس قدر کس سے توبہ　　خدا آپ ہوں گے تو بندہ نہ ہوگا

رہے وصل دن بھر ہمارا تمہارا　　جدا ہو جو محشر ہمارا تمہارا
سُنے کون لیلی و مجنوں کا قصہ　　فسانہ ہے گھر گھر ہمارا تمہارا

منیر اوج تھا ت منابع کی عبث فخر لوگ کرتے میں　　ارے نادان مدح شہ لولاک ہونا تھا

عجز و نخوت نے قدم جب حد سے باہر رکھدیا　　پاؤں پر سر میں نے اُسنے پاؤں سر پر رکھدیا

جان لی رحم جو ان کو دم بیداد آیا　　یہ خوش اخلاق تو غصے کا بھی اُستاد آیا

کیا لکھنؤ سے کام جناب منیر کو　　زنار بند زلف بُتِ رامپور ہیں

نہیں جس میں ول دار وہ دل یہی ہے　　جدا اپنی لیلےٰ سے محمل یہی ہے
غضب ہے اُسے زندہ در گور دیکھوں　　جسے مر کے پالا ہے وہ دل یہی ہے
ادا اُن کی کہتی ہے میں ہوں مسیحا　　قضا میری کہتی ہے قاتل یہی ہے
شب وصل بھی ہے اسے بے قراری　　نرالا زمانے سے کیا دل یہی ہے
کسے آئینہ جان کر توڑتے ہو　　میں پہچانتا ہوں مرا دل یہی ہے
اُلجھتیں جو زلفیں تو سلجھاتے اے بُت　　گرہ پڑ گئی دل میں مشکل یہی ہے
لہو سے مشابہ ہے مہندی کسی کی
سمجھ لے ترا چور اے دل یہی ہے

نہایت ہے منیر افسردہ دل طولِ اسیری سے
مدد کو یا علی پہنچو دم مشکل کشائی ہے

میر مونس مرحوم

میر محمد نواب صاحب مونس میر خلیق کے چھوٹے فرزند اور میر ببر علی انیس کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاعری میں ان کا مرتبہ میر انیس سے کم نہ تھا لیکن گوشہ نشینی نے ان کی شہرت کو مسدود رکھا۔ وضع کے نہایت پابند تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے جس پر چکن کا کام بنا ہوتا تھا۔ نیچے شال اور پر جامدانی کا انگرکھا بے گوٹ کی آستین کا۔ روز پوشاک بدلتے تھے۔ ورزش کا نہایت شوق تھا۔ کندھوں تک زلفیں پڑی رہتی تھیں۔

پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ واقعے کی تصویر پیش نظر ہو جاتی تھی۔ یہ بات مشہور ہے کہ میر مونس سے بڑھ کر کسی نے مرثیہ نہیں پڑھا۔ ابتدا میں غزلیں بھی بہت کہیں۔ یہ مقطع زبان زد ہے

مونس کی گلستاں میں ابھی آنکھ لگی ہے ۵
اے بلبلو یہ شور مچانا نہیں اچھا

انیس کی طرح دبلے پتلے آدمی نہ تھے بلکہ کسرتی بدن تھا۔ مشک گنج میں رہتے تھے۔ مجالس عشرہ ریاست محمود آباد میں پڑھنے جاتے تھے۔ مشہور ہے کہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم مرثیہ گوئی میں آپ ہی کے شاگرد تھے۔ معقول وظیفہ ریاست سے مقرر تھا۔

نواب میر محمد حسین خاں مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں کی مجلس بھی پڑھتے تھے۔ اور وہیں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ گھر سے کبھی پیدل نہیں نکلے سہ پہر کو بوچہ پر ہوا کھانے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے یہاں مجلس ہر مہینے کی چھبیسویں (۲۶) تاریخ کو ہوتی تھی۔ ہمیشہ میر صاحب مرثیہ نو پڑھتے تھے۔ اور حاضرین کا بہت مجمع ہوتا تھا۔

شہر میں اور بھی مجلسیں میر صاحب نے پڑھیں مگر یہ بات کسی مرثیہ گو میں نہ تھی کہ وہ ہر مہینے کی مجلس میں نیا مرثیہ کہتا ہو۔ کیا یہ کہ ہر مرثیے کے ساتھ ایک نیا سلام بھی ضرور ہوتا تھا۔

میر صاحب کے مرثیوں کے متعلق تو ہم کسی دوسرے موقعہ میں لکھیں گے۔ صرف دست سلام کی خوبیوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بات تو ان کے خاندان میں مخصوص تھی۔ کہ زبان اور محاورات کا لحاظ مقدم سمجھا جاتا تھا اور اسی سبب سے میر صاحب کا خاندان ممتاز تھا لیکن میر مونس کے سلام میں محاورات کی تہہ میں استعارات کی چمک دمک نظر آتی تھی۔ اور یہ بات میر مونس کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایک سلام کا مطلع ہے۔

جلوہ ہے دل میں حبّ علی کی شراب کا
مینائے احمری میں ہے پھول آفتاب کا

اسی طرح ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات استعارات وکنایات میں ضرور ہوتی تھی۔

گوہر نکلتے آتے ہیں دریائے طبع سے
ہے ہین آبرو جو کریں آشنا لب

مشکل زمینوں میں محاورے اور زبان کو قایم رکھنا مشکل کام ہے مگر مونس کا کلام اپنی خوبیوں کے ساتھ اس راستے کو بھی طے کرجاتا تھا۔

قبر میں خاک شفا پھولوں کی چادر باہر ‌ ‌ ‌ مجرائی بو ہے ارم پھیلی ہے اندر باہر
دیکھ عبرت سے ذرا گورِ غریباں کیطرف ‌ ‌ ‌ استخواں قبر کے اندر ہیں تو پتھر باہر
باغ عالم میں چلی ہے یہ ہوا خست کی ‌ ‌ ‌ غنچے کرتے ہیں مٹھی سے نہ زر باہر

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر ‌ ‌ ‌ مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر

سلامی نطق و زباں ہزباں اٹھاتے ہیں ‌ ‌ ‌ مرثیہ گوئی کا مزا قدرداں اٹھاتے ہیں

مونس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اپنے بھانجے میر نظم کو بجائے فرزند پرورش کیا۔ ممبر پر ٹھاٹھ سے بیٹھنا، شعر کی تصویر کھینچنا آپ کا خاص حصہ تھا۔ جہاں شاعری کا رنگ دکھاتے تھے لوگوں کی زبان پر واہ واہ کی صدا بلند ہوتی تھی۔ بین دکھلاتے تھے تو ساری مجلس صف ماتم بنجاتی تھی لکھنؤ میں ان کی زود گوئی کی عام شہرت تھی۔ ہر مہینے ایک نیا مرثیہ سننے کے واسطے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ رجب کے مہینے میں جب مرزا دبیر صاحب اور میر انیس صاحب اپنا اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ میر مونس کی چھبیسویں تاریخ کا مرثیہ بہت زوردار ہوتا تھا۔ اور پڑھنے کے انداز میں اپنے بھائی میر انیس سے بھی گوئے سبقت لیجاتے تھے۔

جب میر انیس نے ۱۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ تو مونس کو سخت صدمہ ہوا۔ اور ہر مجلس میں اس غم کا اظہار فرماتے تھے۔ ابھی سال بھر ہوا تھا۔ کہ دفعتہً عید کے مہینے میں جمعرات کی شب درد گردہ اٹھا۔ شدت سے تکلیف تھی۔ آپ نے کرب کی حالت میں اگالدان پر ہاتھ رکھ کر زور دیا اور اٹھنا چاہا۔ اسی حالت میں روح نے مفارقت کی۔ یہ واقعہ پانچ منٹ میں ختم ہو گیا۔ تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔ صبح کو جنازہ بہت دھوم سے اٹھا۔ شہر کے تمام رؤسا شریک تھے۔ کلاں کوٹھی میں غسل دیا گیا۔ گھسین والی بغیا میں جس میں میر انیس مدفون ہیں دفن ہوئے۔ گھسین شاہی میں ایک آئینہ ساز تھا جو شاہی آئینے بنایا کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد لڑکوں نے اس باغ کو بیچ ڈالا۔ اور اب اس باغ میں میر انیس و میر مونس کی قبریں ہیں۔

حکیم مسیحا

حکیم محمد علی خاں مسیحا تخلص شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ پیشہ طبابت کندمی رنگ دراز قد تحقیقات الفاظ کے بہت دلدادہ تھے۔ ناسخ کے خاص رنگ میں غزل کہتے تھے۔ فن سخن میں استاد مشہور تھے۔ مگر معاش محض طبابت پر تھی۔ صاحب تلامذہ تھے۔ نواب مہدی حسن خاں آباد شاگرد ناسخ سے بہت اتحاد تھا۔ عصمت ریختی گو لکھنوی بعد شیخ ناسخ حکیم مسیحا کے شاگرد ہوئے۔ اور انہیں سے اصلاح کلام لیتے تھے۔ حکیم صاحب کے کلام میں حشو و الفاظ بہت ہے اور اپنے استاد کے پورے پورے مقلد تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہوں جس کا باغ عالم میں مقلد
وہ ناسخ بلبلِ ہندوستاں ہے

متروکات ناسخ کی پابندی کو لازم سمجھتے تھے۔

بے اضافت قسیح کیا ہے لکہ حسن کلام
اے مسیحا نون کا اعلان رہنے دیجئے

بات یہ ہے کہ دہلی والے صورت اضافی میں بھی اعلان نون کو جائز رکھتے تھے۔ ناسخ نے اسے متروک کیا۔ اور غیر عطف و اضافت کی صورت میں اعلان نون کو جائز قرار دیا۔ اسی کیطرف حکیم مسیحا نے اشارہ کرکے کہا ہے۔

مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے۔ مگر ان کے مکان پر خود شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ اصلاح بھی دیتے تھے۔ اکثر ملیح آباد لغرض علاج مریض تشریف لے جاتے تھے۔ مذہب امامیہ تھا۔ غزل کے سوا دوسرا کلام ان کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ صاحب دیوان تھے۔ سنہ وفات صحیح نہیں معلوم مگر غالباً بعد غدر یعنی ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔

ناسخ کے ماتم میں کہتے ہیں۔

اے مسیحا کیوں نہ ہو بیرنگ بستانِ سخن حیف دنیا سے جناب ناسخ اشعر اٹھا

اکثر اشعار ان کے زبان زد عام ہیں چنانچہ یہ اشعار نقالوں کی زبان پر ہیں۔

اے پری پیکر ملا تجکو سراپا نور کا — آنکھ آہو کی کمر چیتے کی چہرا حور کا
تیرے پستاں پر نظر آتا ہے عالم نور کا — اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا
حشر سے یہ مدعا ہے آپ کا رخ دیکھ لوں — میں نہیں مشتاق غلماں کا نہ طالب حور کا

اس کے علاوہ آپ کا کلام معنوی نکات سے خالی نہیں ہے۔ اور ناسخ کے رنگ میں ہے۔

آنکھوں سے اشک الفت لب میں نکل گیا — لڑکے نے دیکھ لی جو مٹھائی مچل گیا
اس شمع رو نے مجھ سے جو کیں شبکو گرمیاں — کیسا رقیب آتش حسرت سے جل گیا

اے خدا تو شافع مطلق ہے ہر آزار کا — نام ہے دار الشفا بیشک تری سرکار کا
اس فقیر عشق کو کچھ غم گناہوں کا نہیں — حشر میں کافی ہے تکیہ رحمت غفار کا

یاد چشم سیہ یار نے سونے نہ دیا — مجھکو اندیشہ بیمار نے سونے نہ دیا

آنسوؤں سے ہے سمندر زیر پا بالائے سر — رکھتے ہیں پانی کی چادر زیر پا بالائے سر

وعدہ ناحق ہے آج کا کل کا — یاں بھروسا نہیں ہے اک پل کا
تونے کاٹا جو سر تو بوجھ اترا — اے پری زاد ہو گیا ہلکا
آپ کی ذات ابر رحمت تھی — کیوں نہ سر پر ہو سایہ بادل کا

اہل گردوں اگر نالہ مرا سہہ جائیگا — عنصر خاکی جو زیبا ہے ہوا ہو جائیگا

ہاتھ میں انگیا کی جب چڑیا آگئی — آج ہم عنقا کو لائے دام میں
لکھنؤ کی یاد میں آنکھوں سے خوں جاری ہے آج — یاد آیا میکہ پھرتے تھے حسین آباد میں
خوب واقف ہیں مسیحا حسن و قبح شعر سے
سالہا بیٹھے ہیں بزم ناسخ استاد میں

دل ہے مقیم کوچۂ گیسوئے یار میں
مٹی مری خراب ہے ملک تتار میں

ابروؤں کے لئے دنیا میں بڑا رتبہ ہے
آنکھ پر رکھتے ہیں دلبر نہیں تلواروں کو

عبث انسان کو الفت ہے چاندی اور سونے سے
آل کار سونا خاک میں معلوم ہوتا ہے

ہر اک لب وصف رخ میں کھولتا ہے
اس آئینہ کا طوطی بولتا ہے

گل نہیں سنتے کسی نے کان بہرے کر دیے
نالۂ مرغ چمن اے باغباں بیکار ہے

اے مسیحا گوہر مضمون نہ ہاتھ آیا کبھی
روز جوش قلزم بحر رواں دیکھا کئے

مجھ کو امید رحمت رب کریم ہے
کیا غم ہے شعلہ زن جو بیجا جحیم ہے
روز نشور سے نہیں کم ہے شب وصال
خوف و رجا میں ہوں مجھے امید و بیم ہے
دکھلاؤ آ کے پنجۂ پر نور باغ میں
محتاج شانہ گیسوئے موج نسیم ہے

مسی آلودہ لب پر بانکی کب ترے لالی ہے
کلی لالے کی خالق نے یہ سوسن سے نکالی ہے

مرے پہلو سے آپ جب سرکے
نہ تھمے اشک دیدۂ تر کے
کیا کہیں دنیا سے ہم کیوں کر چلے
بار عصیاں لے کے اپنے سر چلے

مرزا حاتم علی مہر

مرزا حاتم علی بیگ مرحوم، مہر تخلص، تاریخی نام خورشید علی ۱۲۳۰ھ چوتھی جمادی الاول ہفتے کے روز قریب شام جبکہ چیٹے وقت گلزار عدم سے دنیا کی بہار دیکھنے آئے۔ اس زمانے میں ان کے پدر بزرگوار مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڈھ کے تحصیلدار تھے کہ مرزا مہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

جب ان کی عمر ڈھائی برس کی ہوئی تو ان کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی بیگ ماہ پیدا ہوئے۔ مرزا مہر چار برس کے اور مرزا ماہ ڈیڑھ برس کے تھے کہ باپ نے اس جہانِ فانی سے انتقال فرمایا۔ بیوہ ماں نے اپنے حسن انتظام سے دونوں بچوں کی تعلیم اور پرورش میں نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا۔ اور ابھی تعلیم سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ اٹھارہ برس کے سن میں اپنے بیٹے کی دھوم سے شادی بھی کردی۔ مرزا صاحب نے اپنے عقد کی تاریخ نئے طرز پر لکھی ہے۔

چوں مرا قیدی زنداں علائق کردند — سالِ تاریخ عروسی خودم بنوشتم
یعنی آزاد و خوش بودم واکنوں اے مہر — از سرِ جبر گرفتار شدم بنوشتم

قیدی زندانِ علایق بنکر سرِ جبر کا تعمیہ بہت مناسب کیا ہے۔ شادی کے دو برس بعد خدا نے فرزند عطا کیا جس کا نام مرزا سجادت علی رکھا اور تاریخی نام آغا بہرام نکالا۔ آغا بہرام دسویں شوال کو دوشنبہ کے روز صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ مرزا صاحب مرحوم نے اس خوشی کی بھی تاریخ لکھی۔

شوال کی دسویں تھی دوشنبہ کا وہ دن — تو عین نماز جمعہ کا تھا وہ ہنگام
خالق نے عطا کیا مجھے جو فرزند — ہم صولت اسکندر و ہم جرات سام
دل نے کہا مجھ سے مہر اس بیٹے کا — تاریخ بھی ہوئے جس میں رکھنا وہ نام
ناگاہ یہ دی سروشِ غیبی نے ندا — لو ہم نے تو رکھا نام آغا بہرام
۱۲۵۰ھ

آغا بہرام کے تین برس کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا دو برس کے بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

بزرگ ان کے مغل قزلباش اصفہان کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں ان کے دادا مرزا مراد علی خاں قزلباش لکھنؤ میں آئے۔ اور شاہی دربار میں رکن الدولہ کا خطاب حاصل کر کے ممتاز عہدوں پر رہے۔ کچھ دنوں ڈلسو رائے بریلی کے ناظم بھی رہے۔ مرزا مراد علی خان کے والد یعنی مہر کے پردادا نادر شاہ کے وقت میں کمانڈر توپ خانہ ہو کر ہندوستان آئے تھے۔

مہر کو شاعری کا چسکا ابتدائے سن سے تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ برس کے سن میں اچھی طرح شعر کہنے لگے۔ اس لئے کہ اپنے عقد کی تاریخ آپ فارسی میں لکھی۔ اور بہت اچھی لکھی۔ طبیعت کے اقتضا سے مہر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ اور آہ نے آتش سے اصلاح لی۔ شاید دس برس اصلاح لی ہو کہ ناسخ کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کی تاریخ مہر نے جو لکھی۔ اس میں بیشک اپنی استادی کا کمال دکھایا ہے۔ ناسخ کے ایک مقطع کے مصرعہ آخر سے تاریخ انتقال بے کم و کاست نکالی ہے

ناسخ ازل سے بندہ شاہ حجاز ہے (۱۲۵۴ھ)

۱۸۴۴ء میں سند عہدہ منصفی کی حاصل کر کے چنار گڑھ کے منصف مقرر ہوئے۔ وکالت ہائی کورٹ کی سند حاصل کی۔ ابھی عہدہ منصفی کے امیدوار تھے کہ حاسدین نے رخنہ اندازی شروع کی۔ اس واقعہ کو مہر نے ایک تاریخ میں لکھا ہے۔

امیدوار کیا جج نے منصفی کا مجھے | تو مجھ سے ہو گئی ناحق کو حاسدوں کو کد
دیا سوال مری سند پہ صدر میں لے مہر | ہوا وہاں سے بھی آخر سوال ان کا رد
ملا ذریعۂ کامل خدا کا فضل مجھے | اثر پذیر عدو کا نہ ہوگا بغض و حسد
نکالوں سائل موذی کو اب کہو تاریخ | عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپا لیا۔ اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر کے ماموں شریک تھے پھر لکھنؤ سے ان کو لیکر آگرے گئے۔ گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے۔ اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور مرحمت ہوئے۔ اب اپنا قیام آگرے میں کر لیا۔ اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ لیکن موجودہ زمانے کے وکیلوں کی طرح نہ تھے۔ موکل سے کبھی فیس طے نہیں کی۔ مقدمے کی کامیابی کے بعد اگر کچھ موکل نے خدمت کی تو قبول کر لی۔ اور نہیں تو کچھ طالب نہیں ہوئے۔ باہر سے جو لوگ اپیل کرنے آتے تھے اور مہر کو اپنا وکیل کرتے تھے۔ تو

کھانا اور مکان ان کے سر۔ بلکہ اگر ویسی ہی کرائے کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی مرزا صاحب سے وصول کر کے گھر جاتے تھے۔ کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ اس حکومت پر آپ کے اخلاق عام رہے۔ مرزا صاحب کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ لیکن کبھی مذہب کا ذکر نہ آنے دیتے تھے نماز جنازہ شیعہ سنی دونوں نے پڑھی۔ غدر میں بہت سا کلام برباد ہو گیا۔ لیکن شاعری کا ذوق شوق بدستور رہا۔ آپ کے خاص احباب میں مرزا غالب، مولوی غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث خاں بیخبر، میر وزیر علی صاحب صبا تھے۔ غالب مرحوم نے ان کے نام بہت سے خط لکھے ہیں۔ جو ان کی تالیف میں شایع ہو چکے ہیں۔ منشی محمد اسمعیل صاحب منیر اور مرزا دبیر میر انیس صاحب بھی خاص ملنے والوں میں تھے

آگرہ میں جب ان کی شاعری کی شہرت ہوئی تو مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر والئی کاشی مقیم آگرہ ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ بھی قدر دانی کے لحاظ سے مقرر کر دی۔ ان کا تخلص راجہ رکھا گیا۔ اس زمانے میں اردو زبان کے قدر دان ہر جگہ موجود تھے۔ اسی سے لوگوں کو تالیف اور تصنیف کا بہت شوق تھا۔ غدر میں جو کلام کھو گیا۔ اس کے علاوہ بھی مہر کی تصنیف و تالیف کا بہت ذخیرہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہے۔

الماس درخشاں۔ دیوان کا نام ہے۔ اس کا تاریخی نام خیالات مہر ہے جو مصنف کے انتقال کے بعد ان کے پوتے مرزا ہاشم حسین صاحب قزلباش نے چھپوایا ہے۔ اس میں کچھ غزلیں فارسی کی بھی شامل ہیں۔ اور اکثر غزلیں سنگلاخ زمین میں لکھی ہیں۔ جو مصنف کی کہنہ مشقی اور استادی کا اظہار کر رہی ہیں۔

پارہ عروض۔ اردو میں فن عروض کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں انہیں بحروں کا بیان ہے جس میں اردو کے شاعر اکثر طبع آزمائی کیا کرتے ہیں۔ جو مصنف کے ایک شاگرد نے چھپوا کر شایع کیا۔

نیا باغ فرنگستان۔ تاریخ کی ایک کتاب ہے جو ۱۸۶۷ء میں چھپی تھی اس میں مختصر حال شروع عملداری انگریزی سے گورنر اور لفٹنٹ گورنر کا اور بڑے بڑے واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں۔

داغ جگر۔ ایک مثنوی ہے جس میں عاشق و معشوق کا ایک سچا واقعہ نظم کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ پوری مثنوی ایک روز میں نظم کر کے چھپوائی۔

داغ دل مہر۔ ایک واسوخت ہے۔

شبیہہ عشرت میں اپنے فرزند آغا سخاوت علی بیگ کی شادی کے سہرے اور تاریخیں جو احباب نے لکھی ہیں جمع کر کے چھپوائی ہیں۔

ذاب انتقام۔ ایک مذہبی کتاب ہے جس میں مختار کا حال نظم کیا ہے۔

شعاع مہر۔ مثنوی ہے جو ۱۲۷۵ھ میں مطبع حیدری آگرہ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ وہی مثنوی ہے جس کی تعریف غالب نے اپنے خطوط میں لکھی ہے۔ اس میں نگارین بیگم زوجہ مسعود سوداگر پر سلطان محمود کا عاشق ہونا نظم کیا ہے۔

ان کے علاوہ رسالہ زبر و بینات، ہمدم آخرت، بیان بخشائش، عید قیصریہ، پنجہ مہر، توقیر شرف وغیرہ مختلف مقاصد پر نظم کی گئی ہیں۔ اس سے مہر کی پرگوئی کا پتہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور مراثی وغیرہ غیر مطبوعہ آپ کے یادگار ہیں۔ ہر صنف سخن پر تھوڑا بہت کلام مرزا صاحب کا ملتا ہے۔ غزل، استزاد، مسدس، مثلث، مسبع، تضمین، رباعی، مخمس، قطعہ، مثنوی، تاریخ وغیرہ دیوان میں بھی موجود ہیں۔

مادہ تاریخ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ نکالتے تھے ۱۸۶۶ء میں ان کے فرزند مرزا سخاوت علی مسل خواں صدر کلکٹری ایٹہ کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس خوشی میں آپ نے تاریخ لکھی۔

مستقل شد بہ افسری مال — نور چشم دلم چو گل بہ شگفت

مہر تاریخ سال استقلال — نیک سررشتہ دار ایٹہ گفت

۶۶ ۱۸ء

مرزا وزیر علی صبا نے انتقال کیا۔ آپ نے مادہ تاریخ نکالا۔

دور صبا گلشن جنت میں ہے ۱۲۷۱ھ

غالب مرحوم کے انتقال کی تاریخ لکھی۔

بجنان غالب نامی آمد ۱۲۸۵ھ

مہر کی خوش نصیب ماں نے شوہر کے انتقال کے صدمے اٹھانے کے بعد فرزند کے عروج سے دل کو خورسند کیا۔ مہر نے تعلیم پائی، شادی ہوئی، بہو گھر میں آئی، غدر ہوا، بیٹے نے سرکار کی خوشنودی کے لحاظ سے انگریزوں کی جان بچائی، خلعت اور جاگیر سے سرفراز ہوا۔ وکالت سے منصف ہوا۔ پوتا جوان ہوا، کلکٹری ایٹہ کا سپرنٹنڈنٹ مال مقرر ہوا، شادی ہوئی پوت بہو آئی، اپنے باغ کی بہار اچھی طرح دیکھنے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں اس جہان فانی سے

انتقال کیا۔ مہر نے تاریخ لکھی۔

شو و جنتی مادر پاک مہر ۱۲۸۶ھ

ڈاڑھی ہمیشہ منڈوایا کئے۔ کلا صاف رہتا تھا۔ جب خدا نے ۱۲۸۷ھ میں پوتا دیا تو اس خوشی میں آپ نے ڈاڑھی رکھ لی۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ کہنے لگے یہ منت مانی تھی کہ پوتا ہوگا تو ڈاڑھی رکھونگے کشیدہ قامت، رنگ گندم گوں کترواں ڈاڑھی، مخضب۔

روزگار کے لحاظ سے ہمیشہ آگرہ میں رہتے تھے۔ بنچ مجسٹریٹ تھے تین مہینے بنچ میں برابر نشست رہتی تھی۔ تین مہینے فرصت رہتی تھی۔ فرصت کے زمانے میں اٹیہ میں اپنے بیٹے آغا سخاوت علی تحصیلدار اٹیہ کے پاس چلے آتے تھے۔

ایک دفعہ اٹیہ میں تھے کہ ہچکی کا مرض شروع ہوگیا۔ آخر ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۔ اگست ۱۸۷۹ء روز دوشنبہ غروب آفتاب کے بعد مہر آسمان سخن بھی گوشہ قبر میں چھپ گیا۔ دوست احباب کو اس سانحہ کا بہت صدمہ ہوا۔ اور راسد علی کے تکیہ میں دفن ہوئے۔ چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرزا صاحب کے کلام میں روز مرہ اور محاورے کے لطف کے ساتھ کلام میں پختگی اور ترکیب میں متانت اور مضامین بلند ہیں بعض بعض مقام پر استعارات اور تشبیہیں فارسی کی بھی موجود ہیں۔ کلام کو رنگین اور بلند کر کے دکھانے میں خاص ملکہ رکھتے تھے کہیں سادہ شعر میں ایسا مزا پیدا کر دیا ہے۔ جسے سنکر آدمی پھڑک اُٹھے ؎

تجھ سے تو ہے امید ہیں لطف و کرم کی
ہوگا کسی کافر ہی کو ڈر روز جزا کا

کتنا صاف شعر ہے۔ اور کافر کے لفظ نے کتنا مزہ دیا۔

محراب کے عوض خم گیسو ہے یار کا
عالم ہے دل عابد شب زندہ دار کا

اس سادگی کے بعد اس بلند پروازی کو دیکھئے خم گیسو کو محراب بنانا۔ دل کو عابد شب زندہ دار سمجھنا۔ پھر گیسو کی رعایت سے شب کا استعمال کتنا دشوار گذار راستہ تھا۔

ظلم سے بھی ظالموں کو آسرا ہو جائیگا | پیر گردوں کو مرا نالہ عصا ہو جائیگا

محال امر کو ممکنات کر دکھایا۔

آبروئے اشکِ ندامت سے مجھے ہوگی نصیب
پنجۂ مژگاں نزدِ دستِ دعا ہو جائے گا

شعر کی بلندی قابل دید ہے۔

مرے دستِ جنوں کا مشغلہ اچھا نکل آیا
گریباں پھٹ گیا تو دامن صحرا نکل آیا

کیا طوفاں سا طوفاں ہمارے دیدہ تر نے
جو اک آنسو نکل آیا تو اک دریا نکل آیا

غبار خاطر یاران رفتگاں نہ رہا
میں خاک ہو کے بھی دنبالِ کارواں نہ رہا

وہ بے حجاب سوئے عالم شباب آیا
بہار آئی تو گلشن میں باغباں نہ رہا

شکل آئینہ دلِ صاف جو پیدا کرتا
وہ مجھے دیکھتا اور میں اُسے دیکھا کرتا

اشعار بالا میں حسن بندش شکوہ الفاظ حسن تخیل روزمرہ سب موجود ہے۔ ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

میں تو اس چال پہ مرتا ہوں کہ چلتے چلتے
ٹھوکریں ماریں سرِ گورِ غریباں کیا کیا

تجھی سے جسنے پایا مطلب دل ایجد اپایا
بتوں کو برہمن نے عمر بھر پوجا تو کیا پایا

یہ شانِ بے نیازی ہے کہ وارفتہ کیا مجھکو
طبیعت بے غرض پائی دل بے مدعا پایا

چراغ دیر میں شمع حرم میں تیرا جلوہ ہے
تجھی کو ہر جگہ دیکھا تجھی کو جابجا پایا

میرے اور یار کے ہے بیچ میں دریا حائل
جوش آتا نہ ترا دیدۂ گریاں ہوتا

قفل کنجی کی اگر گوندھتے چوٹی صاحب
کوچۂ زلف مجھے گوشۂ زنداں ہوتا

عاقلوں کا ہے یہ کہنا کہ رہی فروغ سادہ لوح
خاک سے آئینہ چمکا خاک اسکندر ہوا

آسماں پر آپ کے جھمکے کا یہ پڑتا ہے عکس
بندہ پرور عقدۂ عقد ثریا کھل گیا

روزی ہوا ہے دانۂ زنجیر و آبِ تیغ
قسمت کا عاشقوں کی یہی آب و دانہ تھا

ذرا تمہیں مرے رونے پہ التفات نہیں — ہنسو خدا سے ڈرو یہ ہنسی کی بات نہیں
خدا کریم ہے اس سے تو ہے امید نجات — زبان واعظ مغرور سے نجات نہیں

پیار سے میں نے جو دیکھا تو وہ فرماتے ہیں — دیکھتے دیکھتے ہوتی ہیں گنہگار آنکھیں

رنگ صحبت بدلتے جاتے ہیں — ساتھ کے یار چلتے جاتے ہیں

صبر ہم بے قرار کرتے ہیں — جبر یہ اختیار کرتے ہیں

چڑھا کشتی پہ جب وہ غیرت مہتاب دریا میں — تو ہالے بن گئے اے مہر سب گرداب دریا میں
ہوا جاتا ہوں پانی پانی احسان احبا سے — عبث مجھکو ڈبوتے ہیں مرے احباب دریا میں

رات دن سینہ زنی خاک بسر کرتے ہیں — عیش و آرام سے ہم خاک بسر کرتے ہیں
روزہ کیا رکھیں وہ میخوار جو میخانے میں — پانی پی پی کے شب و روز گذر کرتے ہیں
صورت گرد رہ قافلہ میں بیکس ہوں — ہمسفر بھی مرے سب مجھ سے حذر کرتے ہیں
پوچھتا کون ہے اب علم و ہنر کو اے مہر — سخت نادان ہیں جو کسب ہنر کرتے ہیں

دل مجھکو دے کے حکم دیا بے نیاز نے — اس دل میں دو وہ درد جو درماں پسند ہو

غافل نہ ہو سرا یہ محل خطر بھی ہے — شب کاٹنی ہے صبح کو عزم سفر بھی ہے

میں وہ قاتل ہوں جس نے تیغ قاتل کو — معرکے میں گلے لگایا ہے

شانہ نہ کرو گیسوؤں کا تار نہ ٹوٹے — دیوانوں کی زنجیر ہے ہشیار نہ ٹوٹے
قربان میں کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھسے — سر پھوڑیئے لیکن مری دیوار نہ ٹوٹے

کوئی دلسوز سوا اس کے نہ دیکھا اپنا　　شمع رونے کو مری قبر پہ آجاتی ہے

کوچ وقت سحر ہمارا ہے　　کوس رحلت گجر ہمارا ہے

سخی بھی خدا کے ہے فضل و کرم سے　　تب تو مہر کا نام حاتم علی ہے

عبث کرتے ہیں کیوں ہر کام میں تدبیر پہلے سے　　وہ ہوگا لکھ چکا جو کاتب تقدیر پہلے سے

کدھر کا چاند ہوا مہر کے جو گھر آئے　　تم آج بھول پڑے کس طرف کدھر آئے

دل سوز ہے کوئی نہ کوئی غمگسار ہے　　مرنے کو ہم ہیں رونے کو شمع مزار ہے

سند ہمیں وہی ہوگی تری کریمی کی　　جو فرد ہاتھ میں اپنے گناہ کی ہوگی

معین اپنے بندوں کا ہر آن تو ہے　　خداوند عالم نگہبان تو ہے

شمع کی تقریر پروانوں سے یہ محفل میں ہے　　وہ زباں پر ہی ہمارے جو تمہارے دل میں ہے

زلف اندھیر کرنے والی ہے　　تم نے ناگن بلا کی پالی ہے
اس کے مذہب کا اعتبار ہے کیا　　مہر اک رند لاابالی ہے

کس منہ سے خداوند ترا شکر ادا ہو　　جب دانت نہوں بندونکے تب دودھ عطا ہو

رومال کے لباس میں ابر آکے بارہا　　پانی پیا کیا مری چشم پُر آب سے

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کے سنہ ولادت کا پتہ کسی تاریخ سے نہیں ملتا اور نہ ان کے باپ کا نام معلوم ہوتا ہے بعض کہتے ہیں۔ شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں متبنے کیا تھا۔ ناصر خاں ناصر دہلوی مولداً فیض آباد کے رہنے والے لکھنؤ میں تشریف لائے۔ محلہ "خیالی گنج"[۵۷] میں سکونت اختیار کی۔ ایک تذکرہ لکھا جس میں تمام شعرا کی قومیت۔ پیشہ۔ سکونت اور شاگردی کا حال لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ امام بخش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور کریم بخش بساطی نے فیض آباد میں ان کو پرورش کیا۔ شیخ صاحب سیاہ فام۔ فربہ بدن آدمی تھے۔ سر منڈا ہوا۔ ڈاڑھی خشخشی تھی۔ اور بانکوں میں مشہور تھے۔ عہد آصف الدولہ میں مرزا محمد تقی ترقی رئیس فیض آباد کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ جاڑوں میں شبکو مرزا صاحب کے مکان کے تنبیٔ پردے اوڑھ لیتے تھے۔ دن کو باریک کپڑے پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم کہتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک رئیس تھے۔ میر کاظم علی۔ انہوں نے ناسخ کو اپنا فرزند بنا لیا تھا۔

اور بعد ان کے مرنے کے انہیں کی دولت ناسخ کو ملی۔

"گؤ گھاٹ" میں ایک قبر ہے جس پر مصرع لکھا ہے۔

گور پدر جلیل ناسخ

لیکن دیوان ناسخ میں جو تاریخ لکھی ہے۔ اس کا مصرع یہ ہے۔

با رسول ہاشمی محشور باد

۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا۔ اس کے دو چار برس بعد ناسخ لکھنؤ آئے۔ کچھ دنوں عسرت میں بسر ہوئی۔ آخر شاعری کے شوق نے ان کو روٴسا امرا سے ملنے کا موقع دیا۔ ناسخ کے سامنے اچھے اچھے شاعر دہلوی دنیا سے رخصت ہو رہے

---

[۵۷] یہ محلہ روشن الدولہ کی کوٹھی کے جنوب میں واقع ہے۔ مولف

تھے۔ میر تقی میر کے انتقال فرمانے کے بعد دہلی کا وقار شاعری کم ہوگیا۔ اسی زمانہ میں جرات نے انتقال فرمایا۔ مرزا رفیع سودا راہی ملک بقا ہوئے۔ اور مصحفی نے سفر آخرت قبول کیا۔

اب شیخ ناسخ کے لئے ترقی کا میدان خالی تھا۔ ناسخ سب سے پہلے میر تقی میر کی خدمت میں اصلاح کے لئے غزل لے گئے۔ انہوں نے بے توجہی سے اصلاح دینے سے انکار کردیا۔ تو ناسخ نے مصحفی سے اصلاح لی۔ اور علی خاں تنہا سے بھی۔

میر کاظم علی کا انتقال ہوگیا تو ایک کثیر رقم بذریعہ وصیت نامہ ملی۔ اب ناسخ آسودہ حال ہوگئے۔ "ٹکسال والے مکان میں سکونت اختیار کی۔

شاگردوں سے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ شعر کہنے کے اوقات مقرر کئے۔ صحن میں متعدد چوکیاں بچھی تھیں۔ اس کے پاس ناندے پانی سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ جب زیادہ گرمی معلوم ہوتی نہانے بیٹھ جاتے۔

زندگی بھر شادی نہ کی۔ مکان کے سامنے مولوی وارث علی صاحب کا کمرہ تھا۔ وہ طلبا کو مفت درس دیتے تھے۔ اور "میزان" سے "شمس بازغہ" تک کے شاگرد ان کے پاس آتے تھے۔ ناسخ عربی سے بے بہرہ تھے۔ جو کتابیں مولوی صاحب طلبا کو پڑھاتے یہ اپنے کمرے میں وہی کتاب لیکر بیٹھ جاتے۔ اور جو سبق ملتا اسے یاد کر لیتے۔ حافظہ اچھا تھا۔ کچھ دنوں میں عربی صرف نحو حاصل کر لی۔ اسی طرح میزان سے شرح جامی تک پڑھ گئے۔

مصحفی نے ایک مرتبہ ان کی غزل اپنے شاگرد بیتاب کو اصلاح کے لئے دیدی۔ اسی روز سے خفا ہوگئے۔ اور اصلاح لینا ترک کردی۔

جب میر و مرزا نہ رہے تو ناسخ کا عروج ہونے لگا۔ اور لکھنؤ کی زبان ان کی تحقیق کے معیار پر دہلی کی قید سے آزاد ہوئی لکھنؤ کے شعرا خود مستند بن گئے۔ ناسخ کی صحبت میں بڑے فلک زدہ شاعر موجود رہتے تھے۔ اور بقدر امکان ان کی خاطر و تواضع کی جاتی تھی۔ اور ان سے شاعری و زبان کے متعلق اپنے شکوک رفع کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ تحقیق الفاظ میں ناسخ کی شہرت ہوگئی۔ آتش کا رنگ تغزل بلند تھا۔ وہ غزل کو عاشقانہ رنگ میں رنگ لیتے تھے۔ اس سبب سے ان کا کلام مطبوع عام تھا۔ ناسخ کو شاعری میں یہ بات تو حاصل نہ تھی۔ مگر ان کی تحقیق حد کمال کو پہنچی

لے۔ لکھنؤ چوک کے وسط میں ایک محلہ ہے۔ مؤلف

ہوئی تھی۔

اصلاح دینے کا اچھا مادہ پیدا کیا تھا۔ اس لئے ان کی طرف امراء۔ رؤسا کا رجوع زیادہ تھا۔ ناسخ کے یہاں دنیاوی ساز وسامان درست تھا۔ دوسرے رؤسا کے مکان پر جانے میں عذر نہ تھا۔

اس لئے ناسخ بہت سے رؤسا اور شرفائے لکھنؤ شاگرد ہوئے۔ یہاں تک کہ نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر بھی ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ اور ایک لاکھ روپیہ نذرانہ کے نام سے پیش کیا۔ آپ نے وہ سب روپیہ اپنے منظور نظر مرزائی صاحب کو دیدیا۔

یہ بات سچ ہے کہ خدا جب دولت دیتا ہے تو غرور آجاتا ہے۔ ناسخ نے دنیاوی دولت بھی حاصل کی اور علمی دولت بھی پائی یعنی محقق اردو مشہور ہوئے۔ دہلی کے مقابلے میں غیر فصیح الفاظ کو ترک کیا۔ اور تمام شعرا نے مان لیا۔ وزیر شہر شاگرد ہوئے۔ امرا نے قدر دانی کی۔ اس پر بھی فربہ اور سیاہ فام ہونے کی وجہ سے آتشیوں نے دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہی۔

سید محمد عسکری عرف میر کلو عرش خلف میر تقی میر ناسخ کے یہاں آتے تھے۔ اور ناسخ ان سے افادہ حاصل کرتے تھے۔ ناسخ کے بعض شاگردوں نے مشہور کیا کہ یہ ناسخ سے اصلاح لیتے ہیں۔ عرش میر کی طرح نازک مزاج تھے۔ ناسخ سے خفا ہوگئے۔ اور اپنے ایک شاگرد میر تراب علی کا تخلص انسخ رکھا۔ انہوں نے ناسخ کے رنگ میں غزل کہی۔ اور ناسخ پر اعتراض کئے۔ آخر لوگوں نے صفائی کرادی۔

ناسخ کی صحبت میں رؤسا کے علاوہ تمام شہر کے معزز شعرا جمع ہوتے اور ناسخ ان کی خاطر مدارات کرتے رہتے۔ اور شاعری کے متعلق اپنے شکوک رفع کیا کرتے۔ اکثر گنّے چھلا کرتے اور افیوں گھلا کرتی۔ کہنہ مشق شعرا کی صحبت میں ان کو شاعری کے متعلق بہت درک حاصل ہوگیا۔ موجودہ زبان کے ثقیل الفاظ نکال ڈالے۔

سہ پہر کو "ٹکسال" کے پھاٹک کے پاس ایک دکان میں بیٹھتے تھے۔ دو چار بچے پیسے کے لالچ میں ان کے پاس آتے۔ ان کو چیز دیتے۔ پیسہ دیتے اور خوش طبعی کیا کرتے۔ قریب شام نواب محسن الدولہ بہادر کی عمارت کی طرف سے شاہ مینا اور حاجی حرمین ہوتے ہوئے "سینھا" دروازے

ایک پھاٹک نواب آصف الدولہ بہادر کے امام باڑے کے قریب تھا۔ اب کھدکر کنگ جارج میڈیکل کالج میں شامل ہو گیا

تفریح کو جاتے تھے۔

اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کو پرچہ گذرا کہ ایک شاعر نواب محسن الدولہ پر عاشق ہے اور سرِ سپہر کو انہیں دیکھنے آتا ہے۔ یہ خبر پہلے نواب محسن الدولہ بہادر کو معلوم ہوئی۔ دوسرے روز انہوں نے ناسخ سے سارا ماجرا بیان کیا۔ ناسخ نے اسی روز سے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا۔

نواب محسن الدولہ بہادر کو معلوم ہوا تو کہنے لگے۔ "ایسا نہ ہو ناسخ گھر میں بیٹھے بیٹھے فاقے کر کے جان دیدے اور مواخذہ مجھ پر ہو۔ پانچ ہزار روپیہ ان کے گھر بھجوا دیا۔ قدر دانی کا زمانہ تھا شاگرد اس قدر استاد کی خدمت کرتے تھے کہ ناسخ گھر بیٹھے سلطنت کر رہے تھے۔ کسی رئیس کی ملازمت کی پروانہ تھی ۱۲۴۰ھ میں نواب آصف جاہ والی دکن نے انتقال کیا۔ ناسخ نے تاریخ وفات کہی۔

دکن تاریک شد اے وائے افسوس

۱۲ ۵ ۴۰

ان کی شہرت "حیدر آباد (دکن) میں اچھی طرح ہو چکی تھی لیکن اس زمانے میں حسن اتفاق سے "الہ آباد" میں تشریف رکھتے تھے۔ کہ مہاراجہ چندو لال مدار المہام دکن نے بارہ ہزار روپیہ بھیجکر ناسخ کو طلب فرمایا۔ انہوں نے استغنا سے جواب لکھدیا کہ میں یہاں ایک سید کے دامن سے وابستہ ہوں۔ اب یہاں سے لکھنو واپس جاؤں گا۔ انتہائے قدر دانی دیکھیئے کہ مہراج نے دوبارہ پندرہ ہزار روپیہ بھیجا اور یہ اصرار کہا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائینگے تو "ملک الشعرا" کا خطاب آپ کو ملیگا۔ حاضری دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ مگر ان کی وارفتہ مزاجی نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔

لکھنؤ سے نکلنے کا یہ سبب واقع ہوا کہ نواب مرزا حاجی اور ناسخ سے بہت دوستی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ شیخ صاحب کے رفیقوں میں ملازم ہوئے۔ کل آمدنی شیخ صاحب کی ان کے پاس جمع رہتی تھی۔ شیخ صاحب سے اور ان سے کسی حساب فہمی پر ان بن ہو گئی۔ مرزا حاجی اک رسا آدمی تھے۔ امرا۔ رؤسا۔ شہزادگان والاشان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

ایک دن نواب غازی الدین حیدر بہادر نے اپنے دربار میں فرمایا کہ اگر ناسخ ہمارے دربار میں قصیدہ تہنیت پیش کریں۔ تو ان کو خطاب "ملک الشعرا" عطا ہوگا۔ نواب مرزا حاجی نے یہ خبر ناسخ کو دی۔ ناسخ نے فرمایا کہ اگر شاہان دہلی کی طرف سے یہ خطاب عطا ہوتا۔ تو میرے لئے باعث فخر تھا۔

نواب مرزا حاجی نے یہ کلمہ بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔

اسی روز نواب معتمد الدولہ بہادر نے فرمایا کہ بہتر ہے آپ صوبہ اودھ سے چند روز کے واسطے باہر چلے جائیں۔ بادشاہ کا مزاج تند ہے۔ خدانخواستہ کوئی امر آپ کے خلاف شان ظہور میں آیا تو ہم لوگوں کی بے عزتی ہوگی۔ ناسخ رات ہی کو الہ آباد روانہ ہوگئے۔ اور نواب مرزا حاجی نے ان کی تمام رقم آپ صرف کی۔

دو دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔ تیسرا دیوان میری نظر سے گذرا ہے مگر افسوس ہے کہ اس وقت موجود نہیں ہے۔

مثنوی "نظم سراج" بھی ناسخ نے لکھی تھی۔ مگر وہ بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک مختصر مولود شریف نظم مطبوعہ موجود ہے۔ قصیدہ ناسخ نے کبھی کسی رئیس کی شان میں نہیں کہا۔ ہجو سے ہمیشہ گریز کیا۔

دلی کے شعرا اکثر باوجود کثیر آمدنی کے مذموم حالت میں بسر کرتے تھے۔ جیسے مصحفی کی غزل فروشی مشہور عام ہے۔ میر مستحسن خلیق بھی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ اور تمام شعرا نے روسا اور امرا کی خوشامد میں ہزاروں قصیدے کہے اور ان سے فیض حاصل کیا مگر لکھنؤ کے دونوں شاعر ناسخ اور آتش کا دامن اس کثافت سے پاک رہا۔ دونوں نے اپنی آن بان رکھی ناسخ نے عیش کیا دولتمندی میں بسر کی۔ آتش نے فاقے کئے اور کسی والئی ملک کی بھی خوشامد نہ کی۔ اور کسی رئیس کی ملازمت کو قبول نہ کیا۔ اس پر بھی ان کی ہمتوں نے ان کو شاہانہ ساز و سامان سے رکھا جس طرف جاتے تھے لوگ آنکھیں بچھاتے تھے لیکن افسوس ہے ان کے بعد اس آن بان کو لکھنؤ کے اور شاعر نباہ نہ سکے۔ اور گردش زمانہ نے ان کو قصاید خوانی پر مجبور کر دیا۔

ناسخ کے شاگردوں میں میر علی اوسط رشک اور خواجہ وزیر اور کپتان مقبول الدولہ قبول اور فتح الدولہ برق اور شیخ امداد علی بحر بہت مشہور ہوئے اور انکے دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔

ناسخ کا مذہب شیعہ تھا۔ آپکی پیدائش فیض آباد میں ہوئی تھی ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ تشریف لائے اور ۱۲۳۴ھ میں اول مرتبہ الہ آباد گئے تھے۔ اکثر ناسخ خون کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے آخر اسی مرض کہنہ کے اشتداد سے ۱۲۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔ اور اپنے مکان واقع محلہ ٹکسال میں دفن ہوئے قبر ان کی موافق اصول مذہب شیعہ زمین دوز بنائی گئی۔ تربت کا نشان پختہ اب تک موجود ہے تھوڑا زمانہ ہوا کہ ان کے ورثا نے اس مکان کو فروخت کر ڈالا۔ افسوس

انتخابِ کلام

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؔ کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پُر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا
شگفتہ مثلِ گل ہر فصلِ گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا
دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اُس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

جس جگہ سے حسن فوراً قدرداں پیدا ہوا
چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا
سخت دل جو ہیں انہیں محروم رکھتا ہے فلک
بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

اس ادا سے دھوئے ہیں دستِ حنائی آپ نے
ہر حبابِ آبِ جو اک دیدۂ پرخوں ہوا

کب ہمارے فکر سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخؔ ہم اس مغفور کا

لبریز اس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ رخ سے کٹورا گلاب کا
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب اک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
جو ہے حسین اس کو ہے نفرت جہان سے
ہوتا نہیں ادھر کبھی منہ آفتاب کا

پریوں کو عمل سے میں تسخیر نہیں کرتا
جز نقشِ درم کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا
کیونکر مرے رونے سے دل نرم ہو اس بت کا
پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا
کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخؔ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

دل میں ساکن ہے خیال اک بتِ بے پروا کا
آشیانہ مرے ویرانے میں ہے عنقا کا

جواب اُس نے نہ بھیجا اور ہم نے خط لکھے اتنے — کہ مہریں کرتے کرتے مٹ گیا نقش اپنے خاتم کا
سخاوت جس کو کہتے ہیں کہانی ہے زمانے میں — بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا
مسی آلودہ لب کو تو نے جس کپڑے سے پونچھا ہے — وہ میرے زخم دل کے واسطے پھاہا ہے مرہم کا
گذر ناگاہ جو میرا ہوا شہر خموشاں میں — عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا
کہیں آئینہ زانوِ سکندر کا شکستہ تھا — کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاکِ جم کا

سیکڑوں آہیں کروں پر ذکر کیا آواز کا — تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا
نازنینوں سے کروں کیا ربط میں نازک مزاج — بوجھ اُٹھ سکتا نہیں مجھ سے کسی کے ناز کا

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا — ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

سر پہ پہاڑ اُن کے ندامے آسماں گرا — جو برگِ گل کو سمجھیں کہ سنگِ گراں گرا

تو نے شہبازِ نگہ کو جو ادھر چھوڑ دیا — ہم نے بھی طائرِ دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

پہنچے ہم آتش نباؤں کو ضرر دشمن سے کیا — شمع کو کرتا ہے روشن تر ستم گلگیر کا

ساقو اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا — رات بھر مجھکو دلِ زار نے سونے نہ دیا

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا — جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا
یہ جوش برپا ہے اشک کا یہ کہ ساتوں دریا میں قطرے سے کم — جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہِ آتشیں کا
یہ ساعدِ نو نکالا ہے اسکے مائے کہ تو نے دیکھا ہو وہ یدِ بیضا — نیام تیغِ تغافلِ صبر لقب ہے قاتل کی آستیں کا

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب ہاں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

نہیں ہے سبزۂ خطِ عارضِ محبوب پر مدفن پر — ہوئے ہیں جمع پروانے یہ آ کر شمع روشن پر

ہے دوا کس کو دوام اس گردش ایام میں
خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں
دور روزا ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں
وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

ہے ریاض فکر ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے گی روح غنی کشمیر سے

اجل سر پر کھڑی ہے خواب غفلت میں نہ مانا ہے
چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے

یہ آدمی ہے کہ برسوں بحال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

کونسا خورشید آج اپنا چراغ خانہ ہے
بزم میں باہم ہجوم ذرہ و پروانہ ہے

فکر سے میں نہیں خالی غم جاناں میں کبھی
کبھی زانوں پہ مرا سر ہے گریباں میں کبھی

یہ جسم زار بے حرکت پیرہن میں ہے
سب مجکو جانتے ہیں کہ مردہ کفن میں ہے
ہیں بے نصیب صحبت جاناں سے ایک ہم
پروانہ بزم میں ہے تو بلبل چمن میں ہے

ہمصفیر اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے
طائر رنگ چمن تک مائل پرواز ہے

مشتاق سب ہیں بدر سے افزوں ہلال کے
دنیا میں قدرداں نہیں صاحب کمال کے
مرنا قبول ہے مجھے دنیا نہیں قبول
غمزے اٹھیں گے مجھ سے نہ اس پیرزال کے

چشم جاناں اور ہے چشم غزالاں اور ہے
وضع انساں اور ہے ترکیب حیواں اور ہے

زنداں میں بھی کوچہ ترا اے یار آتا ہے نظر — بلبل قفس میں ہے مگر گلزار آتا ہے نظر

غش مجھے آیا جو میں پہنچا درِ دلدار پر — پاؤں کے بدلے رکھا سر سایۂ دیوار پر
رہنے دے بس یونہی اے جراح ٹانکے نہ دے — ہنستے ہیں چاکِ گریباں زخمِ دامن دار پر
بیٹھنے کا قصد کرتا ہوں جو کوئے یار میں — سایہ چڑھ جاتا ہے مارے بخل کے دیوار پر

زلف کے صدقے زیادہ رخ سے ہیں مجھ زار پر — دن سے افزوں رات بھاری ہوتی ہے بیمار پر
ہے یہ میرے ضعف کا روزِ جدائی میں اثر — شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر
طاقِ کعبہ پر لگایا ہے کسی نے آئینہ — یا جبینِ صاف ہے یہ ابروئے خمدار پر

قامتِ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں — سرو کو صدقے میں آزاد کیا کرتے ہیں
رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی — دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تیرا دیوان ہے کیا سامنے ان کے ناسخ
جو کہ قرآن پہ ایراد کیا کرتے ہیں

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں — جی نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

خامشی کا جو ہوئی قفلِ دہن ان روزوں — چھوٹ گیا شغلۂ شعر و سخن ان روزوں

ہم زبانِ شمع سے سنتے ہیں ہر بار میں — چاہیے گھل گھل کے مرنا عشق کے آزار میں

سوائے فکر زمانے میں رسم و راہ نہیں — وہ کون جا ہے جہاں یاد زیرِ کاہ نہیں
ہمیشہ کام ہیں غیروں کے میں سدا و تمند — ہما کو اپنے لئے فکرِ عز و جاہ نہیں

صبح وقتِ تیرگی میں شام سے کچھ کم نہیں — دیا نہ نکلا ہے افق سے نیرِ اعظم نہیں

قدح لیے ہوئے گل مثل بادہ خوار آیا　　خزاں چمن سے گئی موسم بہار آیا

تیرے جاتے ہی ہوا رنگ چمن ہو جائیگا　　برگ گل جو ہے وہ برگ یاسمن ہو جائیگا

فرقت ساقی میں مجکو عیش بھی غم ہو گیا　　جام جب دیکھا برنگ شیشہ تو خم ہو گیا

تو نے ظالم دل روشن جو ہمارا توڑا　　غل فرشتوں نے کیا عرش کا تارا توڑا

غم فرقت سے جان تن میں نہیں　　جان کیا تن بھی پیرہن میں نہیں
لے کے بوسے ہوا میں کیوں بیہوش　　مے تو اس کے دہن میں نہیں

کیونکر ترے آگے نہ جھکے حور کی گردن　　بجلی کی کمر شعلے کا منہ نور کی گردن
قربان تری آنکھوں پہ ہے دیدۂ ساغر　　گردن پہ فدا شیشۂ بلور کی گردن

یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ　　ہے تصور میں بہار لکھنؤ
گل سے رنگیں تر ہیں خار لکھنؤ　　نشے سے بہتر خمار لکھنؤ
سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں　　نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ　　ہم تو بلبل ہیں چمن ہے لکھنؤ

آسماں کی کب ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ　　لکھنؤ مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ

نظر آتا ہے ہلال رمضاں جام بھی لا　　ساقیا مجکو سپر چاہیے تلوار کے ساتھ

آگئی موت شب ہجر میں ہیہات مجھے　　اب کہاں یار سے امید ملاقات مجھے

کبھی نالہ کبھی گریہ کبھی وحشت کبھی غش کیا ہی او عشق کیا تو نے خوش اوقات مجھے

دل بر میں ہے جسم میں نہ جی ہے کچھ میری خبر تمہیں اجی ہے

اس ماہ کی فرقت میں جو تارے نکل آئے تاروں سے سوا اشک ہمارے نکل آئے

ہیں حسیں اور بھی پر تجھ میں ہے ہر بات نئی دھج نئی وضع نئی گات نئی بات نئی

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی شورِ بلبل نے کیا یاد بہاری آئی

ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

شبہہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میر نفیس لکھنوی

میر خورشید علی نفیس کو ہم نے اس وقت دیکھا جب اُن کا سن اسّی برس سے تجاوز کر چکا تھا نہایت نیک مزاج، مہذب و متین تھے۔ سیتلا منہ داغ۔ گندمی رنگ، کتابی چہرہ، کرنجی آنکھیں، گول بدن اور دراز قد تھے۔ اس ضعیفی میں بھی کسرت کرنے کا شوق تھا، بازوؤں پر جوشن کے مٹھے بندھے ہوئے، کمر کسی قدر خم ہو چلی تھی، ہاتھ میں چاندی کی شام کی جریب، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں، لباس میں دہلی کا تتبع کرتے، ڈھیلی مہری کا پجامہ، گھٹنوں تک کا مہین شربتی کا کرتا، نیچی کمر توئی کا جامدانی کا انگرکھا، چوگوشیہ ٹوپی، ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ موچھیں بڑی بڑی[۱]۔

"چودھری محلے"[۲] میں رہتے تھے۔ چہرے سے رعب و متانت کے آثار ظاہر ہوتے تھے "سبزی منڈی" سے ہو کر "چوک" میں اشیائے ضروری خریدنے کو تشریف لاتے تو ایک ملازم ضرور ساتھ ہوتا، سودا اپنی پسند اور پرکھ سے خرید کر ملازم کو دیدیتے۔

ان کے والد میر ببر علی انیس تین بھائی تھے۔

میر ببر علی انیس۔ میر نواب مونس۔ میر مہر علی انس۔ جن میں سے میر انس کے فرزند میر وحید۔ میر مونس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور میر انیس کے اولاد ذکور میں تین بیٹے۔

میر خورشید علی نفیس، میر محمد سلیس، میر عسکری رئیس۔ سن کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر نفیس اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے۔ استعداد علمی بہت اچھی تھی۔ فارسی میں مفتی میر محمد عباس سے مشورۂ سخن ہوتا۔ اور اردو میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔

مرثیہ گوئی کی شہرت میں میر انیس کے بعد انہیں کا رتبہ ہے۔ عادت تھی کہ ۲۵۔ رجب کو اپنا نو تصنیف مرثیہ "دلارام کی بارہ دری" میں پڑھا کرتے۔

---

[۱] ۔ یہ وضع ان کے خاندان کی تھی۔ ان کے جد اعلیٰ میر حسن بھی اس وضع کے پابند تھے۔ اور ڈاڑھی منڈانے کی ابتدا خاندان میں انہیں سے ہوئی۔

[۲] ۔ اس نام سے لکھنؤ۔ چوک کے قریب ایک محلہ آباد ہے۔ مولف

پنڈت ولارام کشمیری برہمن تھے، جنہوں نے ایک عالیشان بارہ دری اپنے نام سے بنوا کر مع سازوسامان، فرش وفروش وغیرہ کے شادی وغمی، مجالس ومولود کے جلسوں کے لئے ہندو اور مسلمان عوام کے نام وقف کر دی تھی۔

میر نفیس ادھر ممبر پر تشریف لے گئے۔ ادھر حاضرین مجلس خاموشی کے عالم میں تصویر حیرت بن گئے۔ آپ نے پہلے کچھ رباعیاں پڑھیں، واہ، واہ، کے شور سے بارہ دری ہل گئی، پھر ایک سلام پڑھا بعدہٗ مرثیہ شروع کیا، ڈھائی تین گھنٹے کا ل پڑھتے۔

اسی برس کا سن تھا۔ کمر جھک گئی تھی، چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں، لیکن جس وقت ممبر پہ جاتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گونج رہا ہے۔ ایک مصرعے سے دوسرے مصرعے کا زور بڑھتا جاتا تھا۔

تعریف کے وقت لوگ کھڑے ہو ہو جاتے اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہتے "سبحان اللہ میر صاحب! یہ آپ ہی کا حصہ ہے، نیا مضمون، آج تک نہیں سنا۔ کیا بندش ہے۔ اور کیا پیاری زبان ہے۔ واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اور ٹیپ کا بند تو قسم ہے جناب امیر کی لاجواب ہے"۔

ایک مرتبہ میر صاحب مرثیہ جدید پڑھ رہے ہیں، لوگ کھچا کھچ بھرے ہیں، صاحب مجلس ممبر کے پاس کھڑے ہیں۔ یہ بھی ایک مسن آدمی ہیں۔ میر انیس کے ملنے والے 'میر اعظم علی نام ہے'، رجب کی مجلس ان کی مشہور ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ آٹھ آٹھ روز تک اسی انتظار میں قیام کرتے ہیں۔

میر صاحب اسی انداز سے پڑھ رہے ہیں، محویت کا عالم ہے، ایک مرتبہ آپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا ؎

وہ گرد اٹھی وہ جگر بند بوتراب آیا

ممبر پر نیم قد اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہاتھ سے اشارہ کر کے "وہ" اس طرح کہا کہ لوگ پیچھے پھر کے دیکھنے لگے۔

حیدر آباد (دکن) میں جب تشریف لے جاتے تو آپ کے رہنے کے واسطے ایک خاص کوٹھی ملتی۔ امراء اور روسا وہیں آپ سے ملنے آتے، آپ سب کی خاطر مدارات کرتے، آنریبل راجہ امیر حسن خاں صاحب والیٔ محمود آباد (اودھ) کے زمانے میں آپ اکثر ریاست میں تشریف لے جاتے اور راجہ صاحب آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے۔

ایک حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میر نفیس ایک دفعہ "دیانت الدولہ کی کربلا" میں مرثیہ پڑھنے تشریف لاتے۔ لوگوں کا ہجوم کثرت سے تھا۔ بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا میر صاحب نے ایک سلام پڑھا جس کا مقطع یہ تھا ؎

نفیس افسوس ہم تو یہاں ہیں، دوست جا پہنچے
خراساں میں، نجف میں، روضۂ سبط پیمبر میں

اسی سلسلے میں یہ لکھ دینا بیجا نہ ہوگا کہ میر انیس مرحوم کے ایک نواسے میر احسان علی تھے رئیس تخلص کرتے تھے۔ نہایت خوش گو اور خلیق۔ نواب مرزا امجد علی خاں بہادر مرحوم رئیس شیش محل لکھنؤ "کے داروغہ تھے۔ ابتدا میں تو میر انیس مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ میر صاحب کے انتقال کے بعد اپنے ماموں میر نفیس سے مشورۂ سخن فرماتے۔ اس فن میں طبیعت ایسی مناسب پائی تھی کہ میر نفیس کا سا نقادِ سخن میر احسان علی رئیس کی شاعری کا معترف تھا۔ ایک بات یہ تھی۔ کہ میر احسان علی رئیس شہرت پسند نہ تھے۔ صرف "شیش محل" کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اور وہیں اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھتے۔

کثرت کار سرکاری کی وجہ سے عام مشاعروں کی شرکت سے معذور رہتے۔ افسوس کہ عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کلام ان کا بہت تھا جو ضایع ہو گیا، کچھ ان کے فرزند سید نبن صاحب سے ایک مرتبہ دستیاب ہوا جس کے دو ایک بند یہ ہیں۔

کھولا جو مہر نے علمِ زر نگار کو — پُر نور کر دیا فلکِ بے مدار کو
پایا جو خوشگوار نسیم بہار کو — وجد آگیا ہر اک شجرِ سایہ دار کو
رونق دو چند ہو گئی دنیائے زشت کی
خوشبو ہوا سے آگئی باغ بہشت کی

تڑکا وہ نور کا، وہ بیاضِ سحر کا رنگ — تھا زرد چرخ نیلوفری پر قمر کا رنگ
کوسوں گلوں سے تھا شفقی دشت و در کا رنگ — رہ رہ کے چھوٹتا تھا یہ تھا ہر شجر کا رنگ
جھونکے ہوا کے چار طرف سرد سرد تھے

۱؎ یہ کربلا لکھنؤ "تمنی گنج" میں واقع ہے اور بہت مشہور ہے۔ مولف

ذروں کی یہ چمک تھی کہ ہیرے بھی گرد تھے

دلچسپ بلبلوں کے وہ نغمے ادھر ادھر شاخوں پہ طائروں کا وہ بھرنا کشادہ پر
گویا دلھن بنی تھی ہر اک شاخ بارور شاداب تھے یہ برگ و گل و غنچہ و ثمر
دیکھا جو رعب سبزۂ دشت نبرد کا
مینا اتر گیا فلک لاجورد کا

آئی نظر سحر کی سفیدی جو ناگہاں نکلے حرم سرا سے شہنشاہِ انس و جاں
اکبر نے شد و مد سے جو میداں میں دی اذاں آنسو بھر آئے رونے لگے قبلۂ زماں
جس دم زباں پہ تھا یہ ہر اک دل ملول کی
یہ آخری اذاں ہے شبیہہ رسول کی

پُر نور وہ صفیں وہ نمازی نکو سیر اک ایک حق شناس و نمودار نامور
ذی قدر یادگار رجہاں غیرت قمر سوکھے ہوئے لبوں پہ دعائیں وہ با اثر
تھی حق کی یاد ساغر کوثر نظر میں تھے
گویا ملک زمیں پہ لباس بشر میں تھے

جب پڑھ چکے نماز سحر شاہ تشنہ لب ہر وغا ادھر سے بڑھی فوج بے ادب
تیر آئے جب قریب سپاہ شہ عرب غصے سے بھر اگئے سب خادمان رب
راحت جو غازیوں کو نہ تھی بے لڑے ہوئے
تیغوں کو تول تول کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

مرثیہ کی ابتدا میں تمام ہمراہیوں کا شہید ہونا' اور اس کے بعد عزیزوں کا فدا ہونا' بچوں کا جام شہادت پینا' پھر امام عالی مقام کا ان کی اجازت کے واسطے خیمے میں آنا۔ ان واقعات کو مصنف نے نہایت دردناک الفاظ میں نظم کیا ہے۔ امام کی تشریف آوری پر اہل حرم میں جو حشر بپا تھا اس کے متعلق لکھا ہے:-

روتے ہوئے جو رانڈوں میں داخل ہوئے امام دوڑے سب اہل بیت رسول فلک مقام
آئے نظر جو بیکس و تنہا شہ انام شہ سے کئے لپٹ کے سکینہ نے یہ کلام
اماں ہیں مضطرب شہ انور کو کیا کیا
بابا ہمارے چھوٹے برادر کو کیا کیا

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہِ دیں پناہ
بی بی، شہید ہو گیا رن میں وہ رشکِ ماہ
بھنکتا تھا تشنگی سے جگر، حال تھا تباہ
جنت میں لے گئی انہیں نہرِ لبن کی چاہ
دیکھا نہ ماں کو پھر، کہ اجل پا گئی انہیں
آغوشِ قبر دیکھ کے نیند آ گئی انہیں

بے جاں ہوئے، اب آنے کی ان کے نہیں ہے آس
اب ہم بھی جاتے ہیں کوئی دم میں انہیں کے پاس
رونے لگے یہ کہہ کے جو شبیرِ حق شناس
آئیں قریب بانوئے بیکس بدرد و یاس
فرقت جو دل پہ شاق تھی زہرا کے ماہ کی
دامن قبا کا تھام کے اک سرد آہ کی

کی عرض، دل ہے غم سے دوبار میں کیا کروں
جز موت، اب نہیں مجھے چارا میں کیا کروں
دکھ میں کیا سبھوں نے کنارہ میں کیا کروں
بچوں کا بھی رہا نہ سہارا میں کیا کروں
خالی ہے گود، بانوئے ناشاد لٹ گئی
اصغر سے بھی میں ظلم کے جنگل میں چھٹ گئی

لاشے سحر سے آتے ہیں اے فاطمہ کے لال
باقی نہ پیر ہیں، نہ جواں ہیں، نہ خرد سال
غربت میں آپ بھی ہیں جو آمادۂ جدال
سونپا کسے کنیز کو، یا شاہِ خوش خصال
سب مر چکے اب آنکھوں کا تارا نہیں کوئی
لونڈی کی زندگی کا سہارا نہیں کوئی

پورا مرثیہ اس انداز سے لکھا ہے کہ سننے والوں کا جگر شق ہوتا ہے۔ میر نفیس کو میر احسان علی رئیس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ اب ان کی یادگار اولاد ذکور میں صرف ایک ستید بتن صاحب ہیں۔

میر نفیس باوجود اس کمال کے حد درجہ منکسر مزاج تھے۔ اس نعمت کمال پر ہر ایک سے جھک کر ملتے۔ باتیں اس طرح کرتے کہ گویا کچھ جانتے نہیں ہیں۔ غرور کا کلمہ زبان پر نہ آتا۔ اکثر کہا کرتے "مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا ہے۔"

کسی نے تعریف کی کہ "آپ کے کلام میں بالکل میر انیس مرحوم کا رنگ ہے۔" آپ بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے "یہ آپ نے کیا کہا وہ کجا اور میں کجا۔ ہاں ان کا ایک ادنیٰ خوشہ چیں ہوں۔ آپ نے ان کے مرتبے کو پہچانا نہیں۔"

اپنے سے چھوٹوں کے لئے بھی سلام کو پہلے آپ ہی ہاتھ اٹھاتے۔ نماز، روزے اور احکام شرع کے سخت پابند تھے۔

بچاسی برس سے زیادہ سن ہوا۔ ضعف اور نقاہت کے ساتھ عوارض بھی پیدا ہو گئے۔ چند روز بیمار رہ کر ۱۳۔ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ ہجری مطابق ۱۹۰۱ء کو انتقال فرمایا۔ جس وقت روح لطیف نے جسم خاکی سے مفارقت کی صبح کاذب کا وقت تھا۔ تمام علمائے کرام اور عمائدین شہر شریک تجہیز و تکفین ہوئے۔ جنازے کو فوراً دریائے گومتی پر لے جا کر غسل دیا پانچ بجے شام کو غسل سے فراغت ہوئی۔ تو جنازہ "چوک" کی راہ سے سید تقی صاحب مرحوم مجتہد کے امام باڑے میں لائے۔ مجتہد العصر میر آغا صاحب مرحوم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور میر انیس مرحوم کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے مرثیوں کا ایک حصہ طبع ہو چکا ہے۔ باقی مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

آپ کے فرزند میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج کہتے ہیں کہ جناب مغفور نے ۲۵۔ رجب کو ایک نو تصنیف مرثیہ پڑھا، جس کا ایک شعر یہ تھا۔

دعائے خیر سے روح حزیں کو شاد کریں
ہمارے بعد بھی احباب ہم کو یاد کریں

اور اس کے چار مہینے بعد ذیقعدہ میں انتقال فرمایا۔ اس کو حسن اتفاق کہا جائے چاہے پیشین گوئی۔ نہایت کوشش سے میر نفیس مرحوم کے غیر مطبوع مرثیے ہم پہنچے ہیں، جن کا انتخاب ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ میر صاحب کا رنگ کس قدر گہرا ہے:-

جب گیسوئے شکیں کی گرہ شام نے کھولی
چہرے سے ردا الیلئے خود کام نے کھولی
شمشیر و سپر لشکر اسلام نے کھولی
خیمے میں کمر شاہ خوش انجام نے کھولی
سجدہ کیا زینب نے مصلے کو بچھا کے
مغرب کی اذانیں ہوئیں لشکر میں خدا کے

وہ شام غم انجام وہ جنگل کا اندھیرا
نزدیک سے خیمہ نظر آتا تھا نہ ڈیرا
مہمانوں سے راحت نے جو منہ اپنا تھا پھیرا
خود کہتی تھی وہ رات کہ دو دن آج ہے میرا
تاریک شبیں ہوں گی پہ یہ بات نہ ہو گی
ایسی کبھی اب حشر تلک رات نہ ہو گی

صحرا میں غضب تھا شبِ عاشورہ کا آنا
ہر چشم میں تھا تیرہ و تاریک زمانا
اس رات سے تھا قافلہ راحت کا روانا
وہ شب بھی ڈراتی تھی وہ جنگل تھا ڈراتا
شمشیرِ جفا فوجِ الم تولے ہوئے تھی
ثابت تھا کہ منہ اپنا بلا کھولے ہوئے تھی

خورشید ہوا لشکرِ ضو لے کے جو راہی
دنیا میں ہوا داخلہ فوجِ سیاہی
کی شام سے آکر شبِ تیرہ نے جو شاہی
عالم میں ہوئی روشنی آنے کی مناہی
جب سلطنتِ نور لٹی کون و مکاں میں
ظلمت کا عمل بیٹھ گیا ملکِ جہاں میں

تھا غرب سے تا شرق کسی جا نہ اجالا
خالی کہیں ظلمت سے نہ پستی تھی نہ بالا
رنگ اپنا سیاہی نے درختوں پہ جو ڈالا
تپا بھی ہر اک سبز نظر آتا تھا کالا
ضو خلق سے معدوم تہہ چرخِ بریں تھی
اک نقطہ سیاہی کا زمانے کی زمیں تھی

عالم میں جو ظلمت تھی سرِ شام سے پھیلی
افلاک پہ رنگت تھی ستاروں کی بھی میلی
ضو تھی نہ زحل میں نہ وہ تھا نورِ سہیلی
تھی رات کو یا تھا سیہ خیمۂ لیلی
خارِ غم و اندوہ ہر اک دل میں گڑا تھا
پنہاں تھی ضیا خلق میں اندھیر پڑا تھا

وہ شام، وہ غربت، وہ سیاہی، وہ بیاباں
نہ روشنیِ شمع کسی جا نہ چراغاں
پھرتی تھیں نبی زادیاں سب مضطر و حیراں
ڈھلکی تھی ردا بال تھے زینب کے پریشاں
فرماتی تھیں کل حشر بپا ہوئے گا لوگو
یہ رات جو گذرے گی تو کیا ہوئے گا لوگو

اس مرثیے میں میر صاحب نے شبِ عاشور کا واقعہ نظم کیا ہے۔ پھر تاریکیِ شب کا سین (منظر) دکھایا ہے۔ بعدہٗ لکھا ہے کہ امام عالیمقام نمازِ عشا سے فرصت کر کے مناجات میں مشغول ہوئے، سحر ہوئی، یار و انصار دوپہر تک قتل ہوتے رہے؛ پھر علی اصغر شہید ہوئے۔ اور حضرت بانو کا بین تو دردناک طور پر نظم کیا ہے

اے بانوئے غمدیدہ و مضطر ادھر آؤ
اب صبر کرو اشک نہ آنکھوں سے بہاؤ

تکئے علی اصغر کے نہ چھاتی سے لگاؤ مر جاؤ گی گہوارے کے نزدیک نہ جاؤ

جلتے میں ہیں آفت کے، تباہی میں پڑے ہیں

رکھدو کہیں، اُن کے جو یہ ہیکل یہ کڑے ہیں

یہ سنتے ہی سر پیٹ کے بانو یہ پکاری ہے ہے مرے اصغر تری تربت کے میں واری

تم چھوٹ گئے کیوں کر نہ کروں گریہ و زاری خالی ہوئی یاں آکے بھری گود ہماری

جینے کی نہیں، گر نہ تمہیں پاؤں گی بیٹا

میں پیٹتے ہی پیٹتے مر جاؤں گی بیٹا

یاد آتا ہے اماں کو تمہارا وہ ہمکنا وہ پھول سا رُخ، نرگسی آنکھیں وہ جھپکنا

منہ کھول کے ہر بار مرے منہ کو وہ تکنا جھولے میں وہ بے دودھ وہ بے آب بلکنا

طاقت نہیں ماں کے دل بے صبر میں بیٹا

کیونکر تمہیں آرام ملا قبر میں بیٹا

دلارام کی بارہ دری میں ماہِ رجب کی سالانہ مجلس تھی سامعین رؤسا، امراء دور سے جمع تھے میر صاحب کو تشریف لانے میں کسی قدر وقفہ ہو گیا، آتے ہی دیکھا کہ ماشاءاللہ مجلس بھری ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے، لوگ اکتا رہے ہیں۔ آپ ممبر پر تشریف لے گئے۔ فرمایا" التماس دعا ہے" سب نے دعا مانگی، آپ نے ایک رباعی پڑھی۔ رباعی

مر جائے جو فرزند تو کیا چارا ہے ماں! صبر علاج دل صد پارا ہے

اصغر کو لٹا کے شہ نے تربت میں کہا آرام کرو اب یہی گہوارا ہے

چند رباعیوں کے بعد مرثیہ شروع کیا:۔

پھر طبع سلیم انجمن آرائے سخن ہے پھر دیدۂ دل عاشق سلمائے سخن ہے

پھر جلوہ کناں چہرۂ زیبائے سخن ہے پھر مشک فشاں طرۂ لیلائے سخن ہے

پھر خضر قلم بادیہ پیمائے سخن ہے پھر یوسف دل محو زلیخائے سخن ہے

پھر پیش نظر طور تجلائے سخن ہے پھر طبع کو ذوقِ منّ و سلوائے سخن ہے

یاد آگیا پھر لب کو مزا شہد سخن کا

پھر آج زباں کھولتی ہے قفل دہن کا

یہ مرثیہ حضرت قاسم کے حالات کی نسبت ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

ہاں! شادی و ماتم کا مرقع ہے یہ عالم غم میں کہیں شادی ہے، کہیں بیاہ میں ماتم
رقت بھی ہے، عشرت کی بھی محفل ہے فراہم بکھرائے ہے گیسو شبِ عاشورِ محرم
دیکھا نہ سُنا بیاہ میں اس رنج و محن کو
دولھا کو نہ پانی ہے میسر نہ دلھن کو

غربت میں مصیبت ہے، تلاطم ہے، قلق ہے نوشاہ کی ماں خوش ہے، مگر رنگ بھی فق ہے
ماں چُپ ہے دلھن کی، یہ جگر سینے میں شق ہے اشکوں کو جو روکا ہے، تو چہرے پہ عرق ہے
کہتی ہے میں حیراں ہوں یہ کیا ہوتا ہے لوگو
شادی ہے کہ سامانِ عزا ہوتا ہے لوگو

نواب خلد آشیاں

نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے احسان اردو علم ادب کے طبقے پر بہت ہیں اگر زمانے کے ہر دور کے لئے کوئی مخصوص نام ہوتا تو ہم نواب خلد آشیاں کے زمانے کو علمی قدر دانی کا دور کہتے۔ اس لئے کہ ان کی علمی قدر افزائیوں کی روئیداد ایسی با عظمت ہے جو کبھی مٹائے سے نہیں مٹ سکتی۔ دربار رامپور ہی کی بدولت ہندوستانی منطق و فلسفہ کو ترقی ہوئی۔ اسی با عظمت دربار کی صحبت میں بیٹھکر لوگوں نے شاعری سیکھی۔ اسی دربار کی بیش بہا فیاضیوں نے ایسے ایسے شعراے نامدار ثقات اہل کمال پیدا کئے جن میں ہر ایک کا نام قیامت تک قدرشناسوں کی نگاہوں میں آفتاب کی طرح روشن رہیگا۔ نواب خلد آشیاں جن کی عمر عزیز کے پر تکلف کارنامے والیانِ ملک کے لئے دستور العمل بن سکتے ہیں۔ عیش پرستی کی تمام محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں۔ مگر علمی فیاضیوں کے جلسے ہمیشہ دیر پا ثابت ہوئے۔ اور ان میں انقلاب عالم سے ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

"خلد آشیاں" نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے فرزند رشید تھے۔ آپ ذیقعدہ کی چوبیسویں تاریخ یوم جمعہ وقت طلوع آفتاب ۱۲۸۱ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ نوبتخانوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تہنیت کے نغموں سے تمام رعایا شاد ہوئی۔ ارکان دولت نے نذریں پیش کیں۔ مگر مذہبی پابندی کا یہ لحاظ تھا کہ فی الفور آپ نماز جمعہ کے لئے مسجد تشریف لے گئے۔ بعد ادائے نماز معاودت فرمائی جشن بر پا ہوا۔ رعیت نوازی تو ایسی کی کہ غلے وغیرہ کے محصول میں ایک لاکھ روپئے سال کی آمدنی ریاست کو تھی۔ جلوس فرماتے ہی یہ محصول معاف فرما دیا۔

سال بھر کے بعد مسٹر جان انگلس ریاست میں تشریف لائے بحضور معہ ارکان خاص دیوان خانے میں رونق افروز ہوئے۔ بڑی دھوم دھوم سے گورنمنٹ کی طرف سے دستار بندی کی رسم ادا ہوئی اس جشن کے دوسرے روز تمام علما کو خلعت تقسیم ہوئے۔ شعرا کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تھوڑے دنوں کے بعد ملکہ معظمہ کی طرف سے مسند نشینی کا خلعت آیا۔ اس خوشی کا جلسہ بہت دھوم سے ہوا

حکام عالیمقام شریک جلسہ ہوئے۔ روہیلکھنڈ کے تمام راجہ اور رؤسا جو ریاست کو ہمیشہ نذریں دیتے تھے۔ حاضر ہوئے۔ نہایت دھوم سے جلسہ ہوا۔ اور سواری جلوس کی نہایت شان و شوکت سے نکلی۔ دو لاکھ روپیہ اس جشن میں صرف ہوا۔

عمارتوں کا شوق ہوا تو مسجد جامع۔ سرائے۔ اصطبل۔ فیلخانے۔ گاؤ خانے۔ توشخانے وغیرہ تیار ہوئے۔ بازار پر تکلف بنائے گئے۔ خسرو باغ میں کوٹھی۔ نہایت شان و شوکت کی بنوائی۔ ایک کوٹھی در دولت کے قریب تعمیر ہوئی۔ بینظیر اور بدر منیر کے نام سے دو باغ پختہ بنوائے اور وہاں ہر سال بینظیر میلے کی بنیاد ڈالی تاجروں کے لئے ہر قسم کے مال کا محصول معاف فرمایا۔ اس لئے کہ میلے میں ہجوم زیادہ ہو۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے محکمہ کونسل دار السلطنتہ کلکتہ کی ممبری کے لئے دریافت کیا۔ آپ نے قبول فرمائی۔ اور چار سو آدمی ہمراہ لیکر کلکتے تشریف لے گئے۔ اور شریک کونسل ہوئے۔ ۱۲۸۵ھ میں صاحبزادہ محمد ذوالفقار علی خاں بہادر کی شادی بہت دھوم سے کی ۱۲۸۶ھ میں شہزادہ ڈیوک آف آڈنبرا ہندوستان تشریف لائے۔ خلد آشیاں نے آگرہ میں ان سے تزک و احتشام سے ملاقات کی۔ ۱۲۸۹ھ میں زیارت حرمین شریفین کا ارادہ فرمایا۔ تمام مالی و ملکی معاملات سے دست بردار ہوئے۔ اور تمام رعایائے مضافات ریاست سے عمال کے ذریعہ سے عفو حقوق کی درخواست کی۔ اور خود بنفس نفیس جمعہ کو جامع مسجد میں بآواز بلند اپنے حقوق سے تمام رعایا کو بری الذمہ کیا۔ ماہ شوال کی ساتویں تاریخ ظہر کے وقت جہاز پر سوار ہوئے۔ ۱۲۹۰ھ چھٹی محرم کو زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو کر مع الخیر ریاست میں واپس آئے۔

مہاراجہ بہادر والی ریاست گوالیار شوق دیدار میں ملاقات کو تشریف لائے۔ اور جو کچھ ریاست کی تعریف سنی تھی اس سے زیادہ خلیق اور ملنسار پایا۔

رئیس ٹہری اور نواب لوہارو کا تشریف لانا اور ریاست کی تعریف میں رطب اللسان جانا۔ مشہور و عام ہے۔ نواب جاورہ۔ رئیس اندور' مہاراجہ پٹیالہ۔ بیگم صاحبہ بھوپال' مہاراجہ بنارس مہاراجہ وزیانگرم وغیرہ سے اتحاد اور مستحکم دوستی تھی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا عبد الرشید صاحب مرحوم سے بیعت تھی۔

علمی مذاق نے تالیف اور تصنیف کی طرف راغب کیا۔ پہلے نثر نویسی کی طرف توجہ رہی۔ اردو' فارسی کے نثر مضامین بلبل نغمہ سنج' ترانۂ غم' قندیل حرم' اور شگوفۂ خسروی کے نام سے کتاب کی صورت میں نہایت پاکیزہ کاغذ پر چھپ کر تقسیم ہوئے۔ تاج فرخی کے نام سے

ایک دیوان فارسی طبع ہوا نشۂ خسروانی پہلے اردو دیوان کا نام ہے۔ دستنبوری خاقانی اردو کا دوسرا دیوان ہے۔ درۃ الانتخاب، تیسرا دیوان اردو کا ہے۔ توقیع سخن چوتھے دیوان کا نام ہے۔ یہ چاروں دیوان اردو میں بے مثل ہیں۔ متروکات سے بہت پرہیز کیا۔ جدید الفاظ غلط تلاش کرکے ترک کئے۔ چوتھے دیوان میں یہ التزام کیا ہے کہ الف ہندی جو آخر لفظ میں آیا وہ بھی تقطیع میں نہیں گرایا۔

اعلان نون بحالت اضافت اخفائے نون بغیر اضافت سے پرہیز کیا ہے۔ ان قیدوں پر کلام مزے سے نہیں گرنے پایا۔ جو کچھ فرمایا وہ پسند طبع خاص وعام ہوا بہت سی غزلیں زبان زد ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ ہے۔ چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

انتخاب کلام

لطف کرتا تو کیا ستم ہوتا
اُس کی بے داد پر تو مرتا ہوں

تیرا تو مشغلہ ہے یہ نواب رات دن
میں روز سیتے سیتے گریبان تھک گیا

عاشق ہوا ہوں دل سے خدا کے حبیب کا
حقا کہ مثل ہی نہیں میرے رقیب کا

قصۂ زیست تھا دراز مگر
اُس نے دو باتوں میں تمام کیا

الٰہی کیا کرے گا حشر میں وہ نامراد آخر
جسے آتا نہ ہو کوئی طریقہ داد خواہی کا

ہم تو رو رو کے جتاتے رہے الفت اپنی
زیر لب ہنس کے وہ کہتے رہے ہر بار عبث

دیوانہ گر کہیں گے تو مجکو کہیں گے لوگ
تم کیوں ہو مضطرب مجھے بیتاب دیکھکر

نہ نکلے عشق میں اُف منہ سے اے دل
جہاں کی بات ہو رکھنا وہیں تک

سیر ہو حشر میں جب داورِ محشر پوچھے　　حالِ دل اور میں اس شوخ کی صورت دیکھوں

قاصد کو بھیجتا ہوں تو شوخی کی راہ سے　　میرا ہی نامہ بھیجتے ہیں وہ جواب میں

کروں میں ابتدا کس سے الٰہی　　تمنائیں ہیں دل میں انتہا کی

عیش کا نام نہ لیتا کبھی عالم میں کوئی　　ہم سے دو چار بھی ہوتے جو رنڈلانیوالے

بھیجدے ساری بلائیں کہ ذرا دل بہلے　　اے فلک سوچ تو کسکی شب تنہائی ہے

لازم ہے ایک قبر مری ہر گلی میں ہو　　تا ابد میرے نام مرا کو بکو رہے

نامہ یہ کس کو لکھا ہے جو کبوتر سیکڑوں　　میرے آگے بیٹھے ہیں مشتاق پر کھولے ہوئے

بے خودی کا اب یہ نقشہ ہے کہ ہم　　شکوے کرتے ہیں تری تصویر سے

بھاتے مرہم کے الگ رکھنا مرے ناسور سے　　ان کو میں فردوس میں بدلوں گا حسنِ حور سے

نواب کی صحبت میں ہندوستان کے سرمایۂ نازہ اساتذہ موجود رہتے تھے۔ غزل کی اصلاح منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی مرحوم سے لی۔ خود بھی نقاد تھے۔ طبیعت میں دو دنی ترقی ہوگئی۔

وسیم خیر آبادی

سید محمد عسکری صاحب وسیم خیر آبادی منشی امیر احمد صاحب امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ ان کو منشی صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق بہت رہا ہے۔ امیر اللغات کی ایک جلد کی ترتیب بھی انہیں نے کی ہے۔ منشی صاحب نے خیابانِ آفرینش کی ایک تاریخ پر خود ان کو اپنے ہاتھ سے تلمیذ رشید لکھا ہے۔ بہت مدت تک آپ مہاراجہ صاحب جونپور کے دربار میں بزمرۂ شعرا ملازم رہ چکے ہیں۔ تحقیق و صحت الفاظ کا ان کو بہت شوق ہے۔ ہندوستان کے اطراف و جوانب میں ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ رسالہ گلچیں عرصہ دراز سے مختلف مقامات سے شایع ہوتا رہا ہے۔ گورکھپور سے نکلا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں آیا۔ اب خیر آباد سے نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر منشی وسیم صاحب ہیں۔ خیابانِ آفرینش کی جو تاریخ آپ نے لکھی ہے۔ اس میں انتہا کا نازک تخرجہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے عجب صنعت میں تاریخ وسیم
وصفِ ذاتِ احمد بے میم ہے

پورے مصرعہ میں تاریخ ہے۔ اور اعداد میم کا تخرجہ ہے۔ ایسی تاریخیں حسن اتفاق سے نکلتی ہیں۔ وسیم ان کمالات کے ساتھ حد کے منکسر مزاج آدمی ہیں۔ تغزل کا رنگ منشی ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی سے ملتا ہے ؎

تم وصل کی شب خوبی قسمت ہو کسی کی — پہلو میں جو آجاؤ طبیعت ہو کسی کی
لیلیٰ سے کہو نجد میں بے پردہ نہ آئے — جامہ سے نہ باہر کہیں وحشت ہو کسی کی
منہ چوم لوں کیا بات شب وصل کہی ہے — پھر کیا ہو جو بیجا نہ نزاکت ہو کسی کی
دیوانہ وسیم آئے تو ذمہ ہے ہمارا
پرسش بھی اگر روز قیامت ہو کسی کی

منشی صاحب مرحوم کے زمانۂ حیات میں ایک طرح ہوئی تھی جس میں منشی صاحب کے تمام شاگردوں میں ریاض کے بعد وسیم کی غزل سب سے اچھی رہی تھی ؎

تیر آئیں دل میں اک دن کے لئے — حسرتیں بیتاب ہیں ان کے لئے
ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی — کر گئی بدنام دو دن کے لئے
وہ گھٹا اٹھی ہے پی لو واعظو — ورنہ پھر ترسو گے اس دن کے لئے
غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا — پردہ ہم کرتے تھے اس دن کے لئے

منشی صاحب کے وقت میں "پیام یار" میں ایک طرح ہوئی ؎

پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو

منشی وسیم صاحب کی غزل اسمیں بھی معرکۃ الآرا ہوئی ؎

دیا سر تیغ کو، دم تیر کو، دل اسکے پیکاں کو — قیامت ہو وہ بت اب بھی نہ مانے میرے احساں کو
یہ بھری ہیں حسرتیں تنگی ہیں یہ ارمانوں کا مجمع ہو — کہ رستہ دل میں آنیکا نہیں ملتا ہے پیکاں کو

وسیم اس در پہ جب جاتا ہے درباں ٹوکدیتا ہے
الٰہی جلد بٹھلا دے قضا آواز درباں کو

غمخواروں میں ہوں ۔ بازاروں میں ہوں ۔ اس میں منشی صاحب مرحوم نے بے مثل غزل کہی ہے ۔ اس کے علاوہ حکیم جلال مرحوم تسلیم مرحوم ۔ داغ مرحوم کی غزلیں بہت اچھی ہوچکی ہیں ۔ لیکن منشی وسیم نے اس طرح میں بھی اپنی جدت طبع دکھائی ہے ؎

جب کہا جیتوں نے اسکی میں ستمگاروں میں ہوں — بول اٹھی چین جبیں میں بھی جفاکاروں میں ہوں
دل ہے کیا شئے جس حسیں کے پاس لیجاتا ہوں میں — وہ یہی کہتا ہے میں اس کے خریداروں میں ہوں
خلد ہی میں دی جگہ رحمت نے اس کی حشر میں — لاکھ میں نے یہ کہا میں تو گنہگاروں میں ہوں

جب کوئی گاہک نہ ٹھیرا جنس عصیاں کا وسیم
اس کی رحمت بول اٹھی میں خریداروں میں ہوں

غزل کے علاوہ منشی وسیم صاحب نے اور بھی اصناف سخن میں جوہر کمالات دکھائے ہیں ۔

قطعات تاریخ آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے ۔ سی ۔ آئی ۔ آئی ۔ والی ریاست محمود آباد دام اقبالہ کے فرزند مسعود کی ولادت کے لکھے ہیں ۔ بحر خفیف مسدس میں ایک بہاریہ قطعہ لکھا ہے ۔ اسی بحر میں پورے مصرعہ سے تاریخ نکالی ہے ؎

وہ پھل باغ مراد کا ہے

۲ ۳ ــــــــــ ۱۳ ہجری

یہ قطعہ تاریخ پورا قصیدہ ہے۔ تشبیب اور گریز نہایت نازک رکھی ہے ؎

کس ناز سے آئی ہے بہار آج　　جو گل ہے چمن میں ہنس رہا ہے
آنے سے بہار کے ہر اک گل　　کیا باغ و بہار ہو رہا ہے
اب جوشِ بہار و عکسِ گل سے　　ہر ذرہ نمونہ پھول کا ہے
گلشن کی زمیں ہے گل زمیں آب　　ہے صورت گل جو نقش پا ہے
ہر غنچہ خوشی سے ہے شگفتہ　　ہر پیڑ نہال ہو رہا ہے

اسی طرح بہت بڑی تشبیب کے بعد گریز کرتے ہیں ؎

آقا مرے باغ باغ ہیں آج　　گل نخل امید کا کھلا ہے

اس کے بعد ایک بہت بڑا قطعہ لکھا ہے جس کے ہر مصرع سے تاریخ ولادت نکلتی ہے اور بہت سی تاریخوں میں صنعتیں ہیں۔ نئے نئے تجربے اور نئے نئے تعمیے۔ یہ قطعات ایک کتابی صورت میں چھپے ہیں۔

اس کے ماسوا قصائد میں بھی وسیم صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ بہت سے قصیدے مشکل ردیف و قافیوں میں کہے ہیں۔ حال میں ریاست گوالیار سے ایک خبر آئی کہ والیِ ریاست کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہے اور ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے جس میں تمام امراء و رؤساء جمع ہونگے۔ اور شعراء بھی قصائد تہنیت لکھیں گے۔

جناب مضطر خیرآبادی نے شعراء کی طبع آزمائی کے لئے مصرع طرح بھی شائع کیا ؎

تجھے اے موتیوں والے نیا گوہر مبارک ہو

بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اور خیال ہوا کہ جب ریاست کی طرف سے ایسی تحریک ہوئی ہے۔ اور ریاست کے ایک خاص شخص نے مصرع طرح مقرر کیا ہے تو امید ہے کہ شعراء کو انعام بھی حوصلے سے زیادہ ملیگا۔ شعراء نے دل کھول کے قصیدے لکھے۔ اور بہت سے لوگ بہ امید عزت افزائی گوالیار میں پہنچے۔ لکھنؤ سے صفدر صاحب مرزا پوری۔ شاکر میرٹھی وغیرہ وغیرہ اور دوسرے مقامات سے بھی شعراء آگئے۔

وسیم صاحب نے بھی معرکہ آلارا اسی طرح میں ایک قصیدہ لکھا ظاہر ہے کہ یہ طرح قصیدے کی شان کے لائق نہ تھی۔ اور اس طرح میں قصیدہ کہنا مشکل تھا۔ مگر وسیم صاحب نے یہی نہیں کیا کہ قصیدہ کہا ہو۔ بلکہ قصیدے میں ولادت کی تاریخیں بہت سی صنعتوں میں لکھیں۔ اور

گوالیار پہنچے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وسیم صاحب کا قصیدہ سب سے اچھا رہیگا۔ اور سب سے زیادہ انعام ان کو ملیگا۔ مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ دعوت شعرا ریاست کی طرف سے نہیں ہے بعض اراکین ریاست نے ایک جلسہ قرار دیا ہے۔ البتہ جو شعرا تشریف لائے ہیں اُن کو انعام ریاست کی طرف سے ملیگا۔ جلسے کے روز سب نے اپنے اپنے قصائد پڑھے۔ ریاست میں ایسے لوگ کم تھے جو دادِ سخن دینے کی کامل قابلیت رکھتے ہوں۔ ہم بعض بعض اشعار وسیم صاحب کے درج کرتے ہیں

تجھے اے ساقیِ گل روے احمر مبارک ہو
مبارک ہو خُم مے شیشہ و ساغر مبارک ہو

التزام میکشی کو کس طرح نباہا ہے۔

لگائے اس کے دل پر سنگِ جوبن دخترِ رز کا — مبارک ہو دلِ مینا کو یہ پتھر مبارک ہو
لپک جائے فلک تک شعلہ ہائے آتشِ مے کی — پری کو شیشے کی اُڑنے کو یہ شہ پر مبارک ہو
اتار اب طاق سے شیشے کو ساقی جوشِ نشے میں — ترے ستوں کو سیرِ گنبدِ اخضر مبارک ہو

اسی قصیدے کی تشبیب میں نشہ مے کی تعریف کے ساتھ معلق محفل کا بیان کیا ہے جسکو آج تک کسی قصیدہ گو نے نہیں لکھا۔

دکھائے جام شکل حالِ عالم مثل جامِ جم — تجھے اک دم میں ساقی سیرِ بحر و بر مبارک ہو
زمین و چرخ کی نیرنگیاں آئینہ ہوں تجھ پر — تجھے گلگشت ہفت اقلیم و ہفت اختر مبارک ہو
مبارک ہو نظارہ جلوہ کوہ قاف کا تجھکو — تجھے سیر بہارِ قلزم اخضر مبارک ہو
مبارک ہیں چرخ و ارض تجھکو بزم آرائی — میاں ارض گردوں نغمۂ دلبر مبارک ہو
قریب بزم اور نگ ہوا پر شعلہ رو ٹھہریں — تجھے رقص حسینانِ زمرد پر مبارک ہو
تری محفل سے شرمندہ ہو محفل راجہ اندر کی — زمیں پر رقص بھریاں سیمیں بر مبارک ہو
ہوا پر نغمہ زن بلبل ہوا پر شعلہ رقصاں ہوں — نئے گلرو، نیا گلشن، نیا منظر مبارک ہو

اس تشبیب کے بعد گریز اور گریز کے بعد تاریخی مصارع ہیں۔

یہ تاریخ وسیم مدح گو ہے سال ہجری میں
کہ یہ گلزار زینت کا گل احمر مبارک ہو
۱۳ ۳۴ ہجری

ایک مصرع پانچ عدد کے تعمیہ کے ساتھ ہے۔

ہمارے منہ سے یہ کیسا ہمایوں یہ پری شعر مہاراجہ یہ فرزند پری پیکر مبارک ہو

شعرا کو سنکر بہت افسوس ہوا کہ یہ جلسہ ریاست کی طرف سے نہیں تھا لیکن یہ معلوم کرکے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ شعرا کو ریاست کی طرف فضا یدکا صلہ عطا ہوگا۔ اور خارجاً یہ بھی افواہ سُنی گئی کہ دو ہزار روپیہ دینا ریاست نے منظور کیا ہے۔ مگر ابھی تک شعرا متوقع ہیں۔ وسیم پُرانے مشاق شاعر ہیں اور آپ کی مشق سخن چالیس پینتالیس سال کی ہے اور منشی صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا بہت اتفاق ہوا ہے۔ دفتر امیر اللغات میں مدت تک کام کیا ہے۔

اب سنا گیا ہے کہ ریاست حیدر آباد میں اردو یونیورسٹی قایم ہونیوالی ہے۔ اور اس صیغہ میں اردو زبان والوں کے لئے بہت جگہ ہوگی۔ اگر ریاست اس وقت کے موجودہ چند سن رسیدہ شاعروں کو یونیورسٹی میں لے لے۔ تو زبان کا آغاز با اصول ہو جائیگا اور یہ لوگ چراغ سحری ہیں۔ چند روز سے زیادہ ریاست کا نمک نہیں کھا سکتے۔ ہمارے نزدیک جناب وسیم۔ جناب ریاض۔ جناب کوثر جناب نظم طبا طبائی۔ جناب رشید۔ جناب فصاحت جناب افضل۔ جناب انجم لکھنوی۔ جناب بیخود دہلوی۔ وغیرہ کو اردو یونیورسٹی میں داخل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کی ابتدا با اصول قایم ہو اور یہ بات یادگار رہ جائے گی۔ کہ یونیورسٹی میں ایسے ایسے سخن سنج لوگ داخل تھے۔ ایسے چند نفوس پھر زمانہ پیدا نہ کریگا آجکل ان کا وجود اردو کے لئے غنیمت ہے۔

ہوسؔ دہلوی

نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ شوستری خلف نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ ابن موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات۔

مالک بن ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی طرف سے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اور امت الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ جو زوجہ نواب شجاع الدولہ بہادر موتمن الدولہ بہادر کی بیٹی اور نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ کی حقیقی بہن تھیں۔ اس صورت میں نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ بہو بیگم صاحبہ کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ مگر خلاصہ تاریخ اودھ کا مصنف لکھتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس سبب سے محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بہو بیگم صاحبہ کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ اور شادی بھی محمد شاہ بادشاہ نے ان کی کی۔ بلکہ نواب محمد اسحاق خاں نے بادشاہ سے کہا میری کوئی اولاد نہیں ہے اس کی شادی مجھے کرنے کی اجازت دیجیے۔ بادشاہ نے منظور نہ کیا اور کہا تم کو جس قدر دینا ہو بطور نوید کے دے سکتے ہو۔ تو نواب محمد اسحاق خاں نے اپنا تمام زر، زیور، جواہرات، مال و اسباب بطور نوید پیش کیا۔ اور بائیسوں صوبہ کے صوبہ داروں نے اپنے حوصلے سے زیادہ نوید میں زر و جواہر دیا۔ شادی کے وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی ۱۱۵۸ھ میں ان کی شادی ہوئی اس کے علاوہ وثیقے میں بھی کہیں مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ کا نام نہیں ہے کیونکہ بہو بیگم صاحبہ نے ستر لاکھ روپیہ اپنے اعزا اور ملازمین کے وثیقے میں جمع کیا۔ اس میں مرزا علی خاں کے نام وثیقہ ہے اور ان کو اپنا بھائی بیان کیا ہے لیکن ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح سالار جنگ کو اپنا بھائی بیان کیا ہے۔ ان کے تین بیٹے مرزا قاسم علی خاں مرزا اکبر علی خاں مرزا اصغر علی خاں کا ایک ایک ہزار روپیہ وثیقہ بھی لکھا ہے۔ بلکہ ان کے اور متعلقین مرزا جوہر مرزا اختر مرزا عباس تک کی تنخواہ درج ہے ممکن ہے کہ یہ بھائی مختلف البطن ہوں۔ تو بھی ہوسؔ کا نام وثیقہ میں ضرور ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد تقی خاں نواب مرزا علی خاں کے فرزند نہ تھے دوسرا شبہہ یہ ہوتا ہے کہ ہوسؔ بی لطف النسا بیگم کے شوہر کا نام تھا۔ شاید انہیں کا

تخلص ہوس ہو۔ ان کی تنخواہ بہت تھی اور ان کے بیٹے مرزا حیدر تھے یہ مرزا والاجاہ کے مورث اعلیٰ تھے۔ مگر اس کی تصدیق کسی صحیح تاریخ سے نہیں ملتی مرزا محمد تقی خاں ہوس کا طرز کلام بتاتا ہے کہ وہ دہلوی تھے اور دہلی کی زبان نظم کرتے تھے نواب بہو بیگم صاحبہ کے تمام خاندان کے لوگ لکھنؤ کی زبان استعمال کرتے تھے۔

منشی قمر صاحب نے بھی بیان کیا کہ میں نے مرزا علی خاں بہادر کو دیکھا ہے وہ معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے۔ ان کی اولاد میں ہوس نہ تھے۔ یہ کوئی دوسرے شاعر تھے اور مرزا محمد تقی خاں بی لطف النسا کے شوہر کو تو میں جانتا ہوں وہ آتش کے شاگرد تھے۔ ان کا تخلص مجھے یاد نہیں۔

مرزا محمد تقی خاں ہوس میر تقی میر کے ہمعصر تھے۔ بہرحال ہوس دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور دہلی سے فیض آباد عہد نواب شجاع الدولہ بہادر میں آئے تھے۔

عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے اور محلہ مفتی گنج میں سکونت اختیار کی۔ میر تقی میر کے زمانے میں ان کی اس قدر شہرت نہ تھی۔ ابتدائی شاعری تھی۔ ناسخ کی طرح متروکات زبان انہوں نے بھی قایم کیے۔ اور جو کچھ کہا دہلی کے رنگ میں کہا مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے طبیعت میں رنگینی اور کلام میں بہت شوخی تھی۔

معاملہ بندی میں مشہور ہوئے۔ آخر میں بہت شہرت پائی۔ یہ بات مشہور ہے کہ دہلی والے متروکات کا پرہیز نہیں کرتے۔ مگر ہوس کے کلام میں میر کے زمانے کے متروک الفاظ کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ "ٹک" ہے نہ "نپٹ" ہے۔ نہ "سجن" نہ "لالیاں کالیاں" ہیں بعض جگہ "میاں" کا لفظ نظم کیا ہے۔ جیسے ؎

صحرا ہی میں سکوں ہے نہ گلزار میں وقفہ
گھبرائے ہیں سو ڈھونڈتے پھرتے ہیں میاں ہم

پہلے آپ میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب میر تقی میر لکھنؤ میں تشریف لائے اور ان کی شاعری کے ڈنکے بجنے لگے۔ تو آپ نے سوء ادبی سمجھ کر اپنا تخلص ہوس کر دیا جس کو ایک مقطع میں ادا کرتے ہیں۔ ؎

سُن کر ہوس کے شعر کو اُس شوخ نے کہا
کچھ آگے نام اور تھا یہ نام اب ہوا

متروکات کے پرہیز پر بھی بعض بعض متروک الفاظ ان کے کلام میں موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اس وقت تک ترک نہیں ہوئے تھے ؎

حسینوں بہر خدا اپنے دل میں جا گہ دو
انیس چھوٹے ہیں بے یار بے دیار ہوں میں

اس میں بجائے جگہ کے جاگہ نظم کیا ہے لیکن پھر بھی ہوس نے بہت کچھ زبان کو صاف کیا اور فن شعر میں صفائی، بندش، برجستگی، شستگی، رنگینی، شکوہ الفاظ سب ہی کچھ موجود ہے۔

دیوان غیر مطبوعہ نہایت ضخیم ہے ؎

جوانی ہو چکی پیری سے اب دو چار ہوں میں
خزاں رسیدہ ہوں وا ماندہ بہار ہوں میں

جلا کے راکھ کرائے سوز دل مراتن زار
تری مدد سے کسی دوش کا نہ بار ہوں میں

ایک جگہ عطف کی حالت میں اعلان نون بھی کر گئے ہیں۔

ہنگامہ کفر و دین کا گو جائے سیر تھا
میں واں گیا جہاں نہ حرم تھا نہ دیر تھا

اس میں کفر و دیں کی ترکیب اضافی کے ساتھ نون کا اعلان کیا ہے۔

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا اسکا ذکر
ہر دم زبان یار پہ یادش بخیر تھا

تاثیر بخش تھی یہ ہوس کی صدا ہے آہ
از ہوش رفتہ دشت کا ہر وحش و طیر تھا

مغتنم جانئے ہم صحبت یاراں ہونا
چشم مردم سے ہے اک روز تو پنہاں ہونا

حسن اپنا ہی ہوا دام بلا یوسف کو
بسکہ تقدیر میں تھا ساکن زنداں ہونا

جا مرے دل میں کرائے آبلہ پائے طلب
لطف کیا تاج سر خار مغیلاں ہونا

دست رنگیں میں ترے وزد حنا پیدا ہوا
پنجہ خورشید تھا اشک ید بیضا ہوا

منت ناجنس لینا غیر بدنامی نہیں
کوئی شانے سے سلجھ سکتا ہی دل الجھا ہوا

دیکھکر روتے مجھے محفل میں اسنے ہنس دیا
غنچہ لب بستہ تصویر کیوں کر وا ہوا

شب ہجر میں دم والپسیں اضطرب کا یہ حال تھا
کہ جو سانس ہونٹوں پہ آتی تھی تو نکلنا اس کا محال تھا

ہوا قطع رشتہ زندگی تری تیغ سے تو بجا ہوا
مرا سر ہی دوش پہ بار تھا مراتن ہی مجھپہ وبال تھا

مرا پہنچا آخری وقت جب مجھے دیکھنے کو وہ آئے تب
لگے کہنے اسکو یہ کیا ہوا کہ یہ کل تلک تو بحال تھا

کئے ہم صفیروں نے چہچہے نہ ہوس کا غنچہ دل کھلا
گئی فصل گل اسی دام میں کہ اسیر بے پر و بال تھا

یہ اور تعجب کی بات ہے کہ کہیں تو اتنی صفائی کلام اور کہیں اتنی پرانی زبان کہ میر تقی میر سے بھی پہلے کا کلام معلوم ہوتا ہے

میں کہا بوسا شب غیر سے تھا تم کو کیا — مسکرا کے کہنے لگا شوق مرا تم کو کیا
شکوہ اس بت کی جفا کا جو کیا میں تو کہا — تم تو دنیا میں ہو اک اہل وفا تم کو کیا

لیکن ایسی زبان کسی کسی غزل میں پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا کا کلام ہے۔

کاہشیں پیری کے عالم کی ولاقی ہیں یاد — راحت بے غمی دامن مادر مجھکو

سنا تا کون بچے کے مدلل یہ سخن ہمکو — نہ لگتا لوث بدنامی اگر دامان مریم کو
جدہر جاتا ہوں میں دیوانہ واں پتھر برستے ہیں — خدا محفوظ رکھے شیشۂ ناموس عالم کو

ہوائے آشیاں بندی ہے مجھکو جس گلستاں میں — شرر کا حکم ہے داماں گل پر اشک شبنم کو

سورج کو دم صبح جو وہ مہ نگراں تھا — مغرب پہ بھی مشرق کا منجم کو گماں تھا
آئینہ نہ تھا سامنے جو دیکھتے اس کو — تھا وہ مری آنکھوں میں پہ آنکھوں سے نہاں تھا
گھبرا کے یہاں آئے تھے ہم ملک عدم سے — یاں بھی نہ لگا جی ہمیں کیسا خفقاں تھا
وہ منہ نہ رہا اب جو دکھاؤں میں کسی کو — کیوں حسرت پیری کبھی میں بھی تو جواں تھا
جانا مجھے سب نے پہ کسی نے بھی نہ دیکھا — میں گلشن ہستی میں نسیم گزراں تھا
افسوس کیا دیکھ کے کل ہم نے ہوس کو — کس سوچ میں انگشت تحیر بدہاں تھا

مسی سے لب ہے رنگیں اس غیرت چمن کا — اندیشہ ماہ نو کو کیوں کر نہ ہو گہن کا
اڑ جائے نور اس کا ہو منہ سحر کا کالا — نقشہ لگا رکھ ڈالا ستوں کی انجمن کا
نازک مزاج ہو نہیں اسے خاک دشت غربت
ہر ذرہ مجکو تجھ پہ ہے لاکھ لاکھ من کا

مزا آدم نے کیا پایا جہان سفلہ پرور کا
نہ شفقت باپ کی دیکھی نہ چین آغوش مادر کا
کج و اکج لکھا ناحق ہما را خط پیشانی
میسر تھا نہ منشی قضا کیا تار مسطر کا

واہ رے تیرا اثر اے کاوش دست مژہ
اک نہٹا رفتہ رفتہ زخم کاری ہوگیا

دیوانہ کس قدر ہے یہ موسم شباب کا
تصویر کے لبوں سے ہوں خواہاں جوابکا

شغل شب تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا
دو چار گھڑی روکر بہلاتے ہیں غم اپنا
ارمان ہے پیری میں رو رو کے بصد حسرت
لڑکوں سے جوانی میں قصہ کہیں ہم اپنا

کم نہیں ہے نامہ اعمال مجھ آزاد کا
جرم لکھنا شع تھا مجنون مادر زاد کا
آشنائے لذت درد اسیری ہوں ہوس
منہ مرا جل جائے گر شکوہ کروں فریاد کا

تم نے ظاہر میں گلے لگنے سے انکار کیا
خواب میں ہم نے بہت دیر تمہیں پیار کیا
خوں کا دعویٰ نہیں محشر میں ہے قاتل سے ہوس
میں مکر جاؤنگا اس نے اگر اقرار کیا

شوق خواہش خار مرے دل میں رہگیا
پائے تلاش پہلی ہی منزل میں رہ گیا
مجنوں تجھے خبر نہیں تیری تلاش میں
غش کھا کے کوئی کہتے ہیں محمل میں رہ گیا
میں زمزمہ سرا تو چمن سے گیا ولے
افسانہ اک گروہ عنادل میں رہ گیا

پاس ماں باپ کو لازم تھا شگون بد کا
نہ پنہانے تھے یہ منت کے سلاسل مجکو
خوں بہا کچھ تو مرا چاہیے آخر یارو
پھاڑ دو بہر کفن دامن قاتل مجکو
سفر ملک عدم میں کروں کیونکر تاخیر
بار کرنا نہیں کسنا نہیں محمل مجکو
کیا تعجب ہے ہوس مردہ بے وارث ہوں
پھینک دیں راہ میں گر نعش کے حامل مجکو

کم کرو ذکر جوانی مانو میری بات کو　شمع ہے دن کو کہانی خواب کہنا رات کو

یاد ایام جوانی یاد ہنگام بہار　کیسی کیسی دل میں تھی سیر چمن کی آرزو

غم نہ کھا بکنے کا تو شاد ہو اے یوسف مصر　دل لے بر جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہو
پاس ناموس محبت ہے یہاں تک لازم　دل بھی تیرا تری حالت سے خبردار نہ ہو
خار محفل تو ہیں ہم لیک غنیمت سمجھو　گل کی کیا قدر جہاں میں ہو اگر خار نہ ہو

فراق روح سے اے جسم بقرار نہ ہو　عزیز اس کو نہ کر جس پہ اختیار نہ ہو
وہ آنے کا نہیں سنکر ہجوم پروانہ　ہماری قبر پہ شمع سر مزار نہ ہو
پکارا دیکھ کے آئینہ آپ وہ خود بیں　الٰہی ایسی بلا سے کوئی دوچار نہ ہو
ہے اس غریب کا احوال جائے گریہ ہوس　سوائے یاس کوئی جس کا غمگسار نہ ہو

رنگ گل شگفتہ ہوں آب رخ چمن ہوں نہیں　شمع حرم چراغ دیر قشقہ برہمن ہوں نہیں
قمری سرو قد ناز نغمہ عندلیب حسن　گیسوئے تابدار کا پیچ و خم و شکن ہوں نہیں
خنداں زناں ہیں مجھ پہ بے خردانِ روزگار　اہل خرد میں اے ہوس رونق انجمن ہوں نہیں

ہوس کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ اتنا معلوم ہوا ہے کہ بعد وفات محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں خاص اپنے مکان میں دفن ہوئے۔ نشان قبر ابتک موجود ہے۔

یقین دہلوی

انعام اللہ خاں نام یقین تخلص خلف اظہر اللہ خاں دہلوی شاگرد مرزا جان جاناں مظہر
مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا جانجاناں مظہر میر و مرزا کے شاگرد تھے اور مشائخ کبار میں ان کا شمار تھا۔

یقین سے ان کو بہت محبت تھی اور یقین بھی اپنے استاد کے بہت مداح تھے۔ کبھی کسی دوسرے استاد سے اصلاح نہ لی۔

عہد شاہ عالم بادشاہ دہلی میں ان کے باپ نے کسی وجہ سے خفا ہو کر ان کو قتل کیا اور دیگ میں بند کر کے دفن کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۴ھ کا ہے

پچیس ۲۵ برس کی عمر میں پیوند زمیں ہوئے نہایت خوش رو اور زود فہم تھے قلمی دیوان ان کا ہماری نظر سے گذرا ہے جو ۱۲۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

جسکو بی وزیرن صاحبہ کے واسطے مولانا سید نور الہدا زائر نے مرزا دلاور علی صاحب خوشنویس سے لکھوایا ہے۔ اور اکیس شوال ۱۲۵۵ھ کو ختم ہوا۔

کلام میں فلسفیانہ رنگ ہے۔ زبان بہت قدیم ہے۔ میر تقی میر ملک الشعرا کے زمانہ میں یقین بھی تھے۔ یہ زیادہ تعجب کی بات ہے کہ یقین کی کوئی غزل پانچ شعر سے زیادہ کی نہیں ہے۔

انتخاب کلام

کون کر سکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا ۔۔۔ نارسا ہے شان میں جسکی پیمبر کی ثنا

میں تو ظاہر نہ کروں اسکی جفا کو لیکن ۔۔۔ چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا

اگر مر کر نہ میں اس شوخ کو نذر اپنی جاں کرتا ۔۔۔ خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا

ہیں زخم بہت کاری اس سینے سے کیا ہوگا
اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا

سر پہ سلطنت سے آستان یار بہتر تھا
ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا

یہ دل ایسا خراب کوچہ و بازار کیوں ہوتا
نہ ملتا گلرخوں سے گر تو ایسا خوار کیوں ہوتا

اگر ہوتی نہ کافر باغباں سے آشنا بلبل
تو اتنا گل کے نظارے سے کیوں کرتی حیا بلبل

تو نے جو ہم پہ جفا کی ہے سو مذکور نہیں
تس پہ جو ہم نے وفا کی ہے سو منظور نہیں

جب دیکھتا ہوں تجھکو تنہا سجن چمن میں
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

اسیران قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو
بہار آوے تو اے صبا مت ہمکو خبر کیجو

جفا کے عذر میں اے ظالموں دیر کرو
مری زبان کو شکایت سے مت دلیر کرو

منہ اتنا نہ دیکھا کرو ہو جائیگا دیوانہ
آئینہ کو کہتے ہیں اے شوخ پریخانہ

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھسے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہوے خدا کرے

زنجیر میں بالونکے پھنس جانیکو کیا کہئے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے

دربار رامپور

زبان اردو کی علمی خدمتوں کے لحاظ سے یادش بخیر عرش آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر والی ریاست دارالسرور رامپور کا عہد معدلت مہد بہت وسیع تھا۔ دربار اکبری کے نورتن مشہور ہیں مگر دربار رامپور کے درانتخاب ریاست کی تحقیقی نظر سے داد دینے کے قابل تھے۔ کوئی مشہور نامور شاعر کوئی مستند عالم کوئی دانا پنڈت ایسا نہ تھا جو ریاست کا وظیفہ خوار نہ ہو اور دربار رامپور سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ شاعروں کا ایسا انتخاب تو کسی بادشاہ نے بھی نہ کیا ہوگا اسی حسن تحقیق کو لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ درصل غدر کے بعد لکھنؤ اور دہلی کی علمی دنیا رامپور کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئی۔ اور نواب کی قدر دانی کا ہر ایک نے اعتراف کیا

نواب کے دربار کے شاعر اور نثار جس پایہ کے تھے اس کا ذکر نا دلچسپی سے خالی نہیں دربار رامپور کے یہ ذرّ شہوار تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اور ان کی فیاضی کی داستانیں عام زبانوں پر ہیں۔ ہم اس وقت درباری شاعروں کے مختصر حالات لکھتے ہیں جس سے ہمارا خاص مقصد یہ ہے کہ اگر اور ریاستیں بھی اسی تحقیق سے زبان اردو کی پرورش کے لحاظ سے اپنے دربار میں ایسے نورتن جمع کرتی رہیں۔ تو اردو بہت جلد ایک علمی زبان بن جائے۔

اس تذکرے کا آغاز امیر مرحوم و منیر مرحوم سے کرنا مناسب ہوتا لیکن اس سے قبل ان کے تذکرے شایع ہو چکے ہیں۔ اس سبب سے سردست دربار کے اور شاعروں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

بحر۔ شیخ امداد علی نام ولد شیخ امام بخش لکھنؤ توپ دروازہ کے رہنے والے شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید سیاہ فام دبلے پتلے میانہ قد تھے۔ تحقیق لغت اور صحت الفاظ میں مشہور استاد لوگ ان کی زبان کی سند مانتے تھے۔ ہمیشہ محاورات کی تلاش رہتی تھی۔

نواب سید محمد خاں رند۔ آتش کے شاگرد ان کے بہت قدردان تھے اور کچھ خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ تحقیق الفاظ میں رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے۔ چھوٹی شہزادی اشرف النسا بیگم افسر بہو صاحبہ دختر حضرت امجد علی شاہ بادشاہ کی سرکار سے کچھ قلیل وظیفہ پاتے تھے۔ افیون کا استعمال کرتے تھے۔ عیش باغ کے میلوں میں

اکثر جاتے تھے۔ زندگی بہت عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ ممتاز شاگردوں میں ایک میاں تحیرؔ تھے، جن کی ایک مناجات بہت مشہور ہے ؎

ہر امر میں ہیں قدرتِ ربُ العلا علے رکھتے ہیں اختیارِ بقا اور فنا علے
کیوں کر کہے نہ قوم نصیری خدا علی

استاد کی طرح شاگرد بھی مفلک زدہ تھے۔ افیون بہت پیتے تھے۔ شیریں طوائف اُن کی شاگرد تھی اور وہی کچھ وظیفہ دیتی تھی۔

میاں تحیرؔ ڈاڑھی کا ہمیشہ صفایا رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں شہرت حاصل کرنے کا اہلِ کمال کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس سبب سے میاں تحیرؔ کے کمال کی کیفیت کسی رئیس کے گوش گذار نہ ہوئی ۶۵ برس کی عمر میں تقدیر نے یاوری کی۔ اور نواب کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ایک زباں داں موجود ہے۔ قدردانی اور عزت افزائی کے لحاظ سے خود تحریک فرماکر میاں تحیرؔ کو اپنے دربار میں بلوایا اور خلعتِ خاص سے سرفراز فرماکر بیش بہا تنخواہ مقرر کردی۔ لیکن میاں تحیرؔ کی زندگی لکھنؤ میں کٹی تھی۔ آخر وقت میں غربت کی برداشت نہ ہوسکی۔ اتفاق سے نواب کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا تحیرؔ نے مقطع میں لکھنؤ کی جدائی کا اظہار بہت دردناک پہلو میں کیا۔ نواب کو ان کی حالت پر رحم آگیا اور استفسارِ حال کرکے ان کو کچھ انعام و اکرام دیکر رخصت کردیا۔

خواجہ حسام الدین کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے اُستاد شیخ فضل احمد کیفؔ سے پوچھا آج کل اردو شاعری میں کون کون استاد ہیں۔ کہنے لگے فی زمانہ شیخ امداد علی تحیرؔ کی تحقیق اردو بہت اچھی ہے اور زبان دانی کا دعوے اُن کو زیبا ہے۔ محاورات کو صحت سے نظم کرتے ہیں۔ اور میاں اسیرؔ بھی اُستاد ہیں۔

نواب مہدی علی خاں مرحوم تلمیذ تحیرؔ کہتے تھے کہ جس وقت ہم شاگرد ہوئے ہیں۔ استاد چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی پر رہتے تھے۔ پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ ہے۔ اس میں افیون گھلا کرتی تھی۔ اور ایک کہنہ چٹائی بچھی رہتی تھی۔ تحقیق الفاظ کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور امرا اس بورئے پر بیٹھنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ دن بھر ڈیوڑھی پر رہتے تھے۔ شام کو اپنے مکان پر جاتے تھے۔ توپ دروازہ پر ایک کچا مکان تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ لڑکا تو کوئی نہ تھا۔ بیوی تھیں اور آپ تھے۔ لوگ کہتے ہیں ایک لڑکی تھی جس کو بہت چاہتے تھے۔ اب تو توپ دروازے کا مکان کھد گیا متعلقین کا حال معلوم نہیں۔ زندہ ہیں یا مر گئے۔ اردو الفاظ کے اکثر مخفف آپ کے

پاس دستخط کے لئے آتے تھے۔ خرچ زیادہ تھا۔ آمد کم تھی۔ اس سبب سے بہت تنگدست رہتے تھے۔ شاگردوں سے لینے میں انکار تھا۔ مگر اس پر بھی لوگ خدمت سے دریغ نہ کرتے تھے۔

حکیم میر ضامن علی جلال مرحوم بعد رشک انہیں سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ کم مائیگی نے بحر کی قابلیت کو شہرت نہ دی۔ حکیم مظفر علی خاں کہتے ہیں۔ میں نے میاں بحر کو دیکھا ہے گندمی رنگ چھریرا بدن کترواں ڈاڑھی تھی۔ ان کا ایک لڑکا تھا محفل کودن اکثر مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ بہت خوش الحان تھے۔ بحر وارفتہ مزاج تھے۔ جو کچھ کہتے تھے جمع نہ کرتے تھے۔ نواب سید محمد خاں رند نے ان کی تمام غزلیں ایک دیوان کی صورت میں جمع کیں۔ اور ردیفیں تمام کرا کے دیوان مکمل کیا جس کو بحر نے مطبع مصطفائی میں چھپوایا۔

نواب سلیمان خاں صاحب اسار فرماتے ہیں کہ بحر کو ہم نے بارہا دیکھا۔ آواز میں سخت رعشہ تھا۔ غزل خود نہیں پڑھتے تھے۔ میاں فہم ان کے شاگرد پڑھتے تھے۔ بہت تعریف ہوتی تھی۔ کئی شاگرداں کے ساتھ آتے تھے۔ جب دیوان چھپ چکا۔ تو ایک لغت کی تصنیف میں مصروف ہوئے۔ خدا جانے اس کو تمام کیا یا ناتمام رہ گیا۔ عروض اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اس فن پر بہت ناز تھا۔

ناسخ کے انتقال کے بعد ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اور اس سے یہ غرض تھی کہ اس مشاعرہ میں ناسخ کے تمام شاگرد بلائے جائیں۔ اور اُن کی قابلیت کا اندازہ کیا جائے کہ بعد ناسخ کون جانشینی کے قابل ہے اور اس امر کے فیصلے کے متعلق نواب عاشور علی خاں عاشور کو تکلیف دی گئی۔ جب ناسخ کے تمام شاگرد غزلیں پڑھ چکے تو نواب عاشور علی خاں نے فیصلہ کیا کہ باعتبار امتیاز شاعری میں خواجہ وزیر کو ترجیح دیتا ہوں۔ ورنہ باعتبار فن رشک اور بحر بہت اچھے ہیں۔ اور برق بھی غنیمت ہیں۔

رامپور سے واپس آنے کے بعد میاں بحر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہے۔ تخمیناً ۷۰ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اور کربلائے تال کٹورہ میں دفن ہوئے۔

کلام سے ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ کس پایہ کا شاعر تھا۔

بشر روز ازل سے شیفتہ ہے شانِ شوکت کا — عناصر کے مرقع میں بھرا ہے نقش دولت کا
خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو — ہر اک گھر خانہ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

اہل دنیا خوش ہوں یا ناخوش ہوں یہ پروا نہیں — آسرا رکھتا ہے یہ بندہ خدا کی ذات کا

خدا علیم ہے ہر شخص کی بناوٹ کا — کہو نماز یو سجدے کیے کہ سر پٹکا

بتو خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا — بُرا بھلا یہیں ہو جائے فیصلہ دل کا

شہرا شعرا میں ہو مرے حسن عمل کا — اللہ کرے خاتمہ بالخیر غزل کا
کیا تفرقہ ہے ظاہر و باطن میں تمہارے — دل سنگ سے بھاری ہے بدن پھول سے ہلکا

نقش دنیا کا مرے دل پہ اثر کیا ہوگا — فقر کہتا ہے کہ حاجب نہیں ڈر کیا ہوگا
غم ہے اے بحر تری بے سر و سامانی کا — ہوگی کیونکر تری اوقات بسر کیا ہوگا

اپنا ہو آپ قاتل مٹی میں جیتے جی مل — ڈھا بیٹھ کعبہ دل حج کا ثواب ہوگا

دیکھتا ہوں ایسے رونے کا بُرا انجام ہے — بحر گھل گھل کر حباب آب جو ہو جائیگا

ہم فقیر اللہ کے جھوٹی صدا دیتے نہیں — جو ہمارا جام بھر دیگا وہ جم ہو جائیگا

وقت آخر ہمیں دیدار دکھایا نہ گیا — ہم تو دنیا سے گئے آپ سے آیا نہ گیا
میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا — میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

تیر مارا نہ یار نے خنجر — اک ادا سے مجھے تمام کیا

قدر داں کوئی نہ اسفل ہے نہ اعلا اپنا — نہ زمیں پر نہ فلک پر ہے ٹھکانا اپنا

ضبط نے رکھے لب فریاد بند صبر میرے زخم کا مرہم رہا
شعلہ تھا عہد جوانی اڑ گیا برف تھا ہنگام پیری جم رہا

وہ چھپ گئے اک جھلک دکھا کر ہم رہ گئے اشک ڈبڈبا کر

تیرے ہوتے میں رہوں شہر میں رسوا ہو کر کھینچ اے جادۂ صحرا رسن پا ہو کر
روشنی مال لٹانے ہی میں ہے اے ممسک ہاتھ میں زر نہیں رہتا ید بیضا ہو کر

کیا چشم سرگیں کی ہے شوخی حجاب میں پلکوں میں ہے نگاہ کہ بجلی سحاب میں

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

چھیڑا جو ذکر میرا یاروں نے انجمن میں شمعیں یہ روئیں آنسو بھر بھر گئے لگن میں

حسن سے بڑھ کے زمانے میں کوئی چیز نہیں اپنا گھر بیچتے دیکھا ہے خریداروں کو

ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی۔ بہار دیکھ چکے باغ زندگانی کی

خدا کو یاد کر کیوں بنتی ہے کیمیا گر سے کہ سونا خاک سے ہوتا ہے پیدا لعل پتھر سے

ضیا باری قلم کرتا ہے کیا کیا وصف ساقی میں ملا ہے نور کا فوارہ مجھکو حوض کوثر سے

افشا ہوئے اسرار جنوں جامہ دری سے چھاپے گئے اخبار مری بے خبری سے

زر ہو گیا قارون کو راہ عدم کی روشنی بے دیئے ہوتی نہیں دام و درم کی روشنی

مزید مردم مفلس کا مال ہوتا ہے ذلیل اہل غرض کا کمال ہوتا ہے

نہ ہو شعر گوئی پہ اے بحر نازاں کوئی پوچھتا ہے ہنر ہے تو کیا ہے

پس کے مر جائینگے جوڑا نہ خبردار بندھے ایک اک بال میں سو سو ہیں گنہگار بندھے

تکئے کی یاد چاہئے مسند پہ بیٹھ کر نمگیرہ سر پہ آج ہے کل شامیانہ ہے

حور بنکر ترے کشتے کی قضا آتی ہے دامن تیغ سے جنت کی ہوا آتی ہے
اس کی رحمت ہے مری بادہ کشی پر عاشق نام بوتل کا جو لیتا ہوں گھٹا آتی ہے
بحر اللہ کی درگاہ سے مایوس نہ ہو
اس کو بگڑی ہوئی تقدیر بنا آتی ہے
آنکھیں نہ جینے دینگی تری بیوفا مجھے ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

آج ہنسنے میں جو سب دانت تمہارے دیکھے ہم نے اک برج میں بتیس ستارے دیکھے

پیار کی آنکھ سے دشمن کو بھی جو دیکھتے ہیں ہمنے ایسے بھی ہیں اللہ کے پیارے دیکھے

اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے سوتے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
نقاب میں نہیں بیوجہ منہ چھپائے ہوئے کسی غریب کا آتے ہیں دل دکھائے ہوئے
کہو یہ قافلے والوں سے ہم بھی آتے ہیں بڑھے نہ جاؤ خدارا قدم بڑھائے ہوئے
کہا کسی نے نہ آنا ہمارے دفن کے وقت کہ خاک ڈالو نہ ان پر یہ ہیں نہائے ہوئے

یہ آب آب خال لب یار سے ہوئے شکر ہی جو تھے وہ شربتی اب فالسے ہوئے

جامۂ قدسی بھی آلودہ دامانی ہوئی چاندسی پیری ہیں داغ پشیمانی ہوئی
آبرو ریزی ہوئی اے تجر ایسی بہر رزق صورت گرداب روٹی ہاتھ میں پانی ہوئی

رباعیات

اک جلوہ تھا جس محل میں قندیلوں کا اس کی چھت میں ہے گھر ابابیلوں کا
کل رقص کناں تھے جن منڈیروں پہ مور ہے آج وہاں پہ آستاں چیلوں کا

خم آگیا قد میں ابروؤں کی صورت سب کٹ گئے عضو گیسوؤں کی صورت
غم کھایا جوانی کا یہ ہم نے دن رات سب گر گئے دانت آنسوؤں کی صورت

افسوس پیام مرگ لائی پیری دکھلاتی ہے شان جانگزائی پیری
کیا یہ عصا قد خمیدہ کیا ہے تیر و کماں بدست آئی پیری

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کا زمانہ اردو علم ادب کی خدمتوں کے لحاظ سے بہت زیادہ وقیع تھا تمام ہندوستان کے سخن فہم دربار میں جمع تھے۔ لفظی تحقیق کا بہت شوق تھا۔ ہر شاعر اسی دھن میں رہتا اور یہی خواب دیکھا کرتا تھا کہ اب دربار رامپور میں ہماری طلبی ہوتی ہے۔ ہم منشی نول کشور کے مطبع میں کاپی لکھتے تھے کہ ایک مرتبہ مالک مطبع کے نام ہماری طلبی کا تار آیا۔ منشی جی نے ہم کو بلا کر رام پور کے تار کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ اگرچہ آپ کی حسن کارگذاری کی وجہ سے دل تو نہیں چاہتا کہ آپ مطبع سے جدا ہوں لیکن رئیس رامپور کے مزید احسانات اس کے مقتضی نہیں ہیں کہ ہم ان کے ارشاد کی تعمیل میں عذر کریں۔

مالک مطبع سے رخصت ہو کر نواب کے دربار میں آئے اور ایسی ایسی نعمتیں پائیں جو خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں تیس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اگرچہ اس میں ہماری بسر اوقات نہ ہوتی تھی۔ عید بقرعید کے موقع پر قصیدے پیش کرتے۔ دو سو روپے قصیدے کا صلہ

ملتا تھا۔ اس کے علاوہ نواب کی مہربانیوں سے ہمارا خرچ بہت بڑھ گیا۔ ہمیشہ بنئے کا قرض ہو جاتا تھا۔ نواب کو خبر ہوتی تو بہت افسوس کرتے۔ اور بلا کر پوچھتے کتنا قرضہ دینا ہے۔ ہم صاف صاف کہہ دیتے۔ حضور قرضے سے دوگنی چوگنی رقم عطا فرماتے۔ اور کہتے دیکھو آئندہ قرض لینے سے احتیاط رکھنا مگر یہاں تو نواب کی فیاضیوں نے سیر چشم بنا دیا تھا۔ اور بنیا جانتا تھا کہ ہمیشہ سرکار قرضہ ادا کر دیتے ہیں اس لحاظ سے یہ عادت برقرار رہی۔ اس خراب عادت نے نواب کے بعد بہت تکلیف دی۔ اور آخرش بیس روپیہ ماہوار ہماری پنشن ہو گئی۔

نواب حامد علی خاں بہادر دام اقبالہ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو دادا جان کے وقت کا شاعر سمجھکر دربار میں طلب فرمایا۔ پیری اور ضعف کی وجہ سے آداب تعظیم معاف کئے گئے۔ استفسار حال کیا۔ ہم تو بہرے اور اندھے تھے ہوم سکریٹری صاحب نے ہمارا حال کہا کہ نواب خلد آشیاں کے زمانہ میں تیس روپے ماہوار ملتا تھا۔ اور مزید فیاضیاں تھیں۔ اب پنشن بیس روپیہ ملتی ہے۔ نواب صاحب بہادر نے فرمایا۔ پنشن کیسی یہ کوئی سپاہی تھے کہ اب بندوق نہیں چلا سکتے۔ پنشن کر دی گئی۔ یہ تو شاعر ہیں ان سے خدمت کون سی لی جاتی تھی۔ جواب نہیں کر سکتے۔ عہد خلد آشیاں کے تیس روپیہ برقرار کئے جائیں۔ اور ہمارے عہد کے دس روپیہ ماہوار اضافہ کئے جائیں۔ آئندہ چالیس روپیہ ماہوار بلا شرط خدمت ملا کرے۔ اسی طرح نواب کی فیاضیاں بہت ہی قابل ذکر ہیں۔

مکرم منشی سید ریاض احمد صاحب ریاض فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں بہادر کا دربار ہم نے دیکھا ہے بیشک وہ ایک علمی دربار تھا۔ نواب بہت گورے چٹے قد آور جوان تھے۔ قلعہ مبارک بھون میں دربار فرماتے تھے۔ ان کے دربار میں لوگ دوزانو دست بستہ بیٹھتے تھے چہرے سے سطوت شاہی ٹپکتی تھی۔ کوئی آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ حاضرین دربار روبرو اور ایک طرف بغل میں بیٹھتے تھے۔ علامہ مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی مولوی منشی امیر احمد مینائی۔ منشی محمد اسمٰعیل منیر حکیم سید ضامن علی جلال حاضر دربار رہتے تھے اور دن رات علمی چرچا رہتا تھا۔

نواب فخر زمان الدولہ بہادر فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خان کے دربار میں ہم مدت تک رہے۔ ہم اس کے برابر علمی اور ادبی حیثیت سے کسی ریاست کو نہیں سمجھتے حق تو یہ ہے کہ

رئیس شریف پرور تھا جب تو ہم ایسے نازک مزاجوں کی وہاں بسر ہوئی۔ ہم لوگ خوگر اور باتوں کے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ دانہ کم ملے لیکن کوئی ٹوٹو نہ کہے۔ گھوڑا کہے۔ اس بارے میں نواب کلب علی خاں بہادر مردم شناس تھے اور علی قدر مراتب ہر ایک کی عزت کرتے تھے۔ مچھی بھون کے قلعہ میں دربار ہوتا تھا۔ اور گول گھر میں نواب کا نواڑی پلنگ طلائی پاؤں کا بچھا ہوتا تھا۔ اس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے۔ گرمیوں میں محض ابری پتھر کے چوکے پر اور جاڑوں میں دری چاندنی اونی قالین کے فرش پر درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ نواب کی داہنی طرف نواب حیدر علی خاں بہادر۔ نواب اسد اللہ نواب مفتاح الدولہ اور حقیر اس کے بعد نادر شاہ خاں صاحب عبد اللہ خاں صاحب بائیں طرف اصغر علیخاں صاحب بہادر منشی منیر آفتاب الدولہ قلق منشی امیر احمد اور کوتوال شہر سامنے دست بستہ چوبدار کھڑے ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی کے اندر شاہی قاعدے کے موافق لال پردہ بانات پڑا ہوتا تھا۔ سلام کرانے کو مردھا۔ ساتھ آتا تھا۔

درباری شعرا میں ایک منشی سید محمد اسمعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی تھے۔ ان کے والد کا نام سید احمد حسین تخلص شاد تھا۔ منیر کو عنوان شباب سے شاعری کا شوق تھا۔ لکھنؤ میں آکر شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اور ناسخ کے حکم سے رشک سے اصلاح لینے لگے۔ لکھنؤ کانپور مرشد آباد کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ افیون کا شوق تھا حسن طلب میں ان کا جواب نہ تھا۔ بات بات پر انعام اکرام حاصل کرتے تھے۔ حافظہ بہت صحیح تھا۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم کہتے تھے کہ ان کا سر بہت بڑا تھا۔ نہایت پر گو تھے۔ نواب کے خاص درباری شعرا میں ان کا شمار تھا۔ تحقیق الفاظ بہت اچھی تھی۔ جب سے ریاست رامپور میں تشریف لے گئے زندگی بھر وہیں رہے اور اسی سرزمین پر دفن ہوئے۔ سرکار سے سو روپئے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ آپ کا ایک کلیات منیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ میں چھپا ہے۔ جس میں تین دیوان ہیں۔ دیوان اول منتخب العالم حاشیہ پر ہے۔ دوسرا دیوان تنویر اشعار مع عبارات نثر حاشیہ پر ہے۔ تیسرا دیوان نظم منیر متن میں ہے۔ اسی کے آخر میں ایک مثنوی بھی شامل ہے۔

دوسری کتاب مثنوی معراج المضامین چھپی ہے۔ کلیات منیر کی طبع کے لئے کئی ہزار روپیہ

نواب کلب علی خاں بہادر نے مرحمت فرمایا تھا۔ کلام بہت پاکیزہ تھا۔ چند شعر منتخب کئے جاتے ہیں۔

بندہ ہوں اے منیرؔ خدائے کریم کا
صراف ہوں خزانۂ فیضِ عمیم کا

کعبے کے سامنے دل خانہ خراب تھا
یہ جھونپڑا حضور محل کا جواب تھا

جائے انصاف ہے دم کیوں نہ گلے میں اٹکے
اے اجل گھر ہے قریب رگ گردن انکا

عجز و نخوت نے قدم جب حلقے سے باہر رکھ دیا
پاؤں پر سر میں نے اُسنے پاؤں سر پر رکھدیا
جب مری گردن پر اس نے کند خنجر رکھدیا
بادھر کے نیچے گراں جانی نے پتھر رکھدیا

روکے بیٹھے تھے رہِ میکدہ ممبر والے
جھوٹتی اُگئیں قبلے سے گھٹائیں کیوں کر

نیند آتی ہے ہر ایک کو آغوشِ لحد میں
شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا

منیرؔ نے اپنے دیوان میں ایک قصیدہ نواب صاحب کی تعریف میں لکھا ہے۔ اس میں آپ کی علمی قدردانیوں کا حال بھی لکھا ہے۔ سرکاری اطبا کا مفصل حال لکھنے کے بعد شعرائے دربار کے نام بھی نظم کئے ہیں۔

مجمع شاعران نامی ہے
شاعری کی ہے گرم بازاری
بحرِ منشی اسیرؔ اور امیرؔ
ہمسرِ انوری و مختاری
طبع پاک عروجؔ و داغؔ سے ہے
منفعل ابر کی گہر باری
ہے جلالؔ و ضیادؔ شاغل سے
محفلِ نظم جلوہ گر ساری
مثنوی میں صباؔ و خواجہ بشیرؔ
رونق شاعری و نثاری
بدرؔ شاداںؔ غمیؔ غنیؔ ہر دم
رہتے ہیں مدح خواں سرکاری

فارسی گو نثار شیرازی ترزبانی میں ابر آزاری
فن تاریخ میں رسا منصور جان صاحب کی ریختی پیاری
سب سے بڑھکر منیر کو حاصل
بے کمالی و ہرزہ گفتاری

اٹھارہ شاعروں کا ذکر تو منشی منیر نے کیا ہے۔ جو درباری شاعر تھے لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے شاعر تھے۔ جو وقتاً فوقتاً دربار میں داخل ہوگئے۔

یاران گذشتہ

اردو زبان کی خدمت کرنے والے' زبان کے محفوظ رکھنے والے' محاورات کی پابندی برتنے والے' تحقیق الفاظ میں کسی کی رورعایت نہ کرنے والے' متروکات کی پابندی کرنے والے' اردو کو اپنا موروثی مال بتانے والے' اصطلاحات پر قایم رہنے والے' شعر اور شاعری کو زندہ رکھنے والے شعرا کس کس مپرسی کی حالت میں دنیا سے سفر کر جاتے ہیں۔ اور ہم کو خبر تک نہیں ہوتی۔ ابھی کل کی بات ہے جو لوگ ہمارے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جن کی ذات سے شاعری کی زینت تھی۔ جو شمع بزم کلام تھے۔ جن کی خوش بیانی خوش گوئی کی ہم داد دیتے تھے۔ جن کی شاعری سرمایۂ ناز تھی۔ قبر کے تاریک گوشے میں سو رہے ہیں۔ نہ کوئی ان کا دیوان مطبوعہ ہمارے پاس ہے کہ اسی سے اُن کی یاد تازہ کریں نہ کوئی اُن کا تذکرہ ہے جس سے ہم کو اُن کی موت زندگی کے واقعات معلوم ہوں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ میں نے قصد کیا ہے۔ کہ کبھی کبھی ایسے شعرا کا مختصر حال اور کچھ منتخب کلام لکھ کر صفحۂ دنیا پر ان کی یادگار قایم رکھوں ورنہ کچھ مدت کے بعد عزیزوں کے نام سے بھی کوئی واقف نہ رہیگا۔

مجھے اتنا موقع تو نہیں ملتا کہ اُن لوگوں کے واقعات تخلص کے لحاظ سے ردیف وار لکھوں۔ لیکن جن کے نام یاد آجاتے ہیں اور کوئی شعر مل جاتا ہے۔ نوٹ کر لیتا ہوں۔ اور وہی ناظرین کی دلچسپی کی غرض سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں ایسے لوگوں کا حال نہیں لکھا جائیگا۔ جن کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔ یا دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔

بندے علی خاں صاحب زیبا لکھنوی شاگرد نواب محمد حسن خاں صاحب شیدا لکھنوی نہایت خوشگو شاعر تھے اور لکھنو کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے تخمیناً ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

ذکر حسن غنز دے کا ہوتا ہے ۔۔۔ دل یہ کہتا ہے ہوں ہمیں نہ کہیں
ناز اٹھاتا ہے نازنینوں کے ۔۔۔ دل بھی ہو جائے نازنیں نہ کہیں

مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں صاحب جگر اسسٹنٹ کمشنر ہردوئی و رئیس لکھنؤ مشہور بہ ناظم صاحب خلف آغائی صاحب مرحوم۔ مرزا صاحب بہت خلیق تھے۔ مشاعروں میں بہت شریک ہوتے تھے اور شاگرد بھی کسی کے نہ تھے۔ اکثر غزلیں ان کی گائی جاتی ہیں۔

غیر کے ساتھ جو عشرت میں نہیں کاٹی رات ‌‌‌ پھر یہ بے وقت مری جان جماہی کیسی
کہتے ہو غیر سے ملنے کی شہادت کیا ہے ‌‌‌ اپنی آنکھوں ہی سے دیکھا تو گواہی کیسی

شیخ فدا علی صاحب عیش لکھنوی تلمیذ عرش دہلوی و خلیل لکھنوی ان کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا، شعر کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ نہایت خوشگو تھے۔ اگلی وضع تھی۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ تخمیناً ستر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔

روبکاری میں یہ مشکل ہے الٰہی کیسی ‌‌‌ دیں گے اعضا مرے محشر میں گواہی کیسی
دل سے کیونکر نہ مجھے ابروئے قاتل ہو عزیز ‌‌‌ قدر تلوار کی کرتے ہیں سپاہی کیسی
قدر نعمت کی مثل سچ ہے کہ ہے بعد زوال ‌‌‌ عیش اس عہد میں یاد آتی ہے شاہی کیسی

سید ولایت احمد صاحب تسنیم سب انسپکٹر خیر آبادی تلمیذ امیر مینائی بہت یارباش آدمی تھے۔ تخمیناً ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

میری سی نہ غم دوست طبیعت ہو کسی کی ‌‌‌ میں شوق سے لیتا ہوں مصیبت ہو کسی کی
کس ناز سے بولے وہ مرے دل کو دکھا کر ‌‌‌ لے لے کوئی ہم سے جو امانت ہو کسی کی

محمد حیات بخش صاحب رسا شاعر دربار رامپور تلمیذ داغ دہلوی۔ تخمیناً ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

یہ نہ ہوگا اور کو جا ہوں تمہارے سامنے ‌‌‌ اور اگر جا ہوں تو بیشک میں گنہگار ہوں نہیں ہوں
عشق کر کے ہم نے کیا کیا اپنی رسوائی ہوئی ‌‌‌ ہر گلی میں شور ہے بدنام بازاروں میں ہوں

حافظ عبدالاحد صاحب آہ لکھنوی خلف عبداللہ خاں صاحب مہر لکھنوی تلمیذ مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی خوشنویس تھے۔ کتابیں اچھی لکھتے تھے۔ جوانی میں تپ دق میں مبتلا ہو کر

کلکتہ میں انتقال فرمایا ؎

یہ کیا خبر تھی کہ یوں دورِ آسماں ہوگا
کہ تجھ سا دوست طرفدارِ دشمناں ہوگا

بڑی مہم ہے یہ العدا آبرو رکھ لے
سنا ہے چاہنے والوں کا امتحاں ہوگا

مزاج تک نہ دمِ نزع پوچھئے گا حضور
وہ کیا کہے گا جو کچھ دم کا میہماں ہوگا

شاہ قمر الدین حیدر آروی تلمیذ حقیر بلگرامی کسی قدر گراں گوش تھے۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ کوئی مشاعرہ نہ چھوٹتا تھا کچھ مدت ہوئی انتقال فرمایا ؎

بزم سے اُٹھ کے چلونگا تو مچل جاؤں گا
میں کچھ ارمان عدو ہوں کہ نکل جاؤنگا

غم یارانِ گذشتہ کا عبث ہے شکوہ
وہ گئے آج جہاں سے تو میں کل جاؤنگا

مولوی علی میاں صاحب کاملؔ لکھنؤ کے ثقات شعرا میں ان کا شمار تھا۔ قصیدہ گو شاعر مشہور تھے۔ مرثیے بھی بہت تصنیف فرمائے۔ تمام اصنافِ سخن میں قادر تھے۔ کلام پُر مغز ہوتا تھا۔ چھ سات برس ہوئے انتقال فرمایا۔ سن شریف ستر سال سے تجاوز کر گیا تھا ؎

لے لے گئے سمجھ کے تبرک لحد کی خاک
اعمالِ نیک نے مری مٹی خراب کی

سید مہدی صاحب حبیبؔ لکھنوی برادر زادہ عشق بہت خوش گو شاعر تھے۔ تخمیناً سات برس ہوئے انتقال فرمایا۔ چالیس۔ پینتالیس برس کی عمر تھی ؎

یہ نیا رشک ہے غیروں کو ملال اچھا ہے
کہ مرے جاتے ہیں جب سے مرا سال اچھا ہے

کیسا شکوہ وہ دمِ نزع بھی پوچھیں تو کہوں
تم سلامت رہو اب تو مرا حال اچھا ہے

ان میں اکثر شاعر ایسے ہیں جن کے دیوان مرتب تھے لیکن طبع ہونیکی نوبت نہ آئی افسوس

امیر و داغ

منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم لکھنوی اور نواب فصیح الملک داغ دہلوی اس آخری زمانے میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دونوں شاعر ماہر تھے۔ ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا زبان و معاملات کا فریفتہ۔ ان کے تاریخی حالات تو اور تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ اور مکمل واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی تو کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دونوں کا مرتبہ شاعری میں کیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ دونوں شاعر دنیائے اردو کے لئے غنیمت تھے۔ زبان کی بہت خدمت کی۔ دونوں کا پایۂ سخنوری بہت بلند تھا۔ منشی امیر احمد امیر کے کلام میں نازک خیالیوں کے ساتھ ساتھ شکوہ الفاظ کی شیرینی بھی ملی ہوئی تھی۔ معانی آفرینی میں ان کا مرتبہ کسی نازک خیال فارسی شاعر سے کم نہ تھا۔ اور عمدہ بات یہ تھی کہ باوجود شکوہ الفاظ دقت پسندی کو وہ ناجائز رکھتے تھے۔ ان کے کلام کے سمجھنے میں کسی تاویل کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی فکر سخن ایسی ہے جیسی ایک علامہ فن کی ہونی چاہئے۔ ان کے اکثر اشعار اپنے انداز بیان سے اہل فن کو مزا دیتے تھے۔ شوخی بیان گو کم تھی۔ مگر احاطہ تغزل سے کوئی شعر باہر نہ تھا۔

نواب فصیح الملک داغ مرحوم بھی وہبی شاعر تھے اردو محاورات و اصطلاحات کو برمحل صرف کرنا ان کا حصہ تھا۔ اور خدا نے ان کی طبیعت کو شعر کے مناسب پیدا کیا تھا۔ اور وہ دہلی کے محاورات نظم کرتے تھے۔ لیکن اکثر تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں وہ لکھنؤ کی تقلید کر جاتے تھے۔ جیسے "فکر" - "سانس" کو مونث نظم کیا ہے۔ اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ دونوں زبانوں کا ایک مرکز ہو جائے۔ ایک کے محاورے کو دوسرا برا نہ سمجھے۔ حالانکہ محاورات اور تذکیر و تانیث کے صرف بعض الفاظ میں کچھ یونہی اختلاف ہے۔ ایسا اختلاف لکھنؤ کے بعض ثقات کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اس سے تو تحقیقات کو فائدہ پہونچتا ہے۔ بہرحال دونوں استادوں کے کلام سے زبان دہلی و لکھنؤ کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ داغ کے کلام میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے نہیں ہے۔ اور معاملہ بندی میں وہ

اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ دونوں کا کلام اپنی اپنی آن رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

امیر

آہوں سے سوز عشق مٹایا نہ جائیگا آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اس میں آہوں کو آندھی سے اور سوز عشق کو چراغ سے استعارہ کیا ہے۔

داغ

دل لیکے اس کی بزم میں جایا نہ جائیگا یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائیگا

داغ نے اس مطلع میں مدعی کو دشمن کے معنی پر صرف کیا ہے۔ جو محض ہندی ہے۔ یہ خاص محاورہ اہل زبان کا ہے۔

امیر

گھر میں تمہارے غیر سے جایا نہ جائیگا آغوش نور میں کبھی سایا نجائیگا

داغ

اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا میں جاؤں گا اگر مرا سایہ نہ جائیگا

امیر

لاؤں میں اس سے دل میں کدورت محال ہے یہ لال خاک میں تو ملایا نہ جائے گا

داغ

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائیگا

امیر

جلدی سے پلا دے مجھے ساقیا شراب ہوں ناتوان جام اٹھایا نہ جائے گا

داغ

فتنہ نہیں ہوں جس کو اٹھایا کرے فلک مجھسے گرے ہوئے کو اٹھایا نہ جائیگا

بیقرار دل اور اختیار دل میں بھی دونوں نے غزلیں کہکر داد سخن دی ہے۔

امیر

جاتا تو اس کے کوچہ میں ہے بار بار دل کھائے نہ چوٹ یاس کی امیدوار دل

امیر نے یاس کی چوٹ میں بہت نزاکت پیدا کی ہے

داغ

مجھسا ندے زمانے کو پروردگار دل آشفتہ دل فریفتہ دل بے قرار دل

کیا برجستہ مطلع نکلا ہے۔

امیر

بزم وصال ہے کہ کوئی صیدگاہ ہے میرے شکار تم ہو تمہارا شکار دل

داغ

یہ صیدگاہ عشق ہے ٹھہرائیے نگاہ صیاد مضطرب سے نہ ہوگا شکار دل

امیر

تسکین دے تصور جاناں کسے کسے بیتاب ادھر ہو جان ادھر بے قرار دل

داغ

تاثیر عشق ہے یہ ترے عہد حسن میں مٹی کا بھی بنائیں تو ہو بے قرار دل

امیر

ٹھنڈی ہیں اسکے آگے حسینوں کی گرمیاں پتلا ہے شوخیوں کا مرا بے قرار دل

داغ

اس نے کہا ہے صبر پڑے گا رقیب کا لے اور بے قرار ہو لے بے قرار دل

مزاروں میں غمگساروں میں کہتے ہیں۔

امیر

وہ بے کس ہوں نہیں ہے کوئی میرا غمگسار نہیں فقط اک دل ہے سو وہ بھی تمہارے جاں نثار نہیں

داغ

رہے گا کوئی تو تیغ دو دم کے یادگار نہیں مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزار نہیں

امیر

پچلے ساقی ہنسے بولے اگر آئی ہے یاروں میں دلھن بنکر نہ بیٹھے دختر رز بادہ خواروں میں

داغ

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہدے اشاروں میں مزہ ہے رات دن چلتی رہے پرہیز گاروں میں

انتخاب کلام امیر

حُسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا | لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا
باغ عالم کا تماشا باعثِ غفلت ہوا | دیکھنا آنکھوں کا کانوں کے لئے افسانہ تھا
وصل ہوتا کس طرح خلوت کہاں تھی رات کو | پھول تھے نرگس کے رکھے شمع تھی پروانہ تھا
دیر کی تحقیر کراتنی نہ اے شیخ حرم | آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا
میں پرانا مست ہوں جنت مرا کاشانہ تھا مطلع | حور ساقی چشمۂ کوثر مرا پیمانہ تھا
دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر | تھا انا الحق حق مگر اک حرف گستاخانہ تھا

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا | یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا
میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں | اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

موباف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا | آنچل لٹک رہا ہے عروس بہار کا
جھونکا ادھر نہ آئے نسیم بہار کا | نازک بہت ہے پھول چراغ مزار کا

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا | درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانہ دل کا

کیا میں اے پردہ نشیں قتل کا خواہاں ہوتا | شرم آتی تجھے خنجر بھی جو عریاں ہوتا
درد ہی تھا دل بیمار کا غمخوار قدیم | اب یہ صورت ہے کہ وہ بھی نہیں پرساں ہوتا
جب وہی حور نہیں خلد میں تو داورِ حشر | جھونک دیتا مجھے دوزخ میں تو احساں ہوتا

حیا بولی ابھرا جو جوبن کسی کا | مٹا دوں گی میں چلبلاپن کسی کا
رقیبوں سے وہ خوش رقیب اُن سے راضی | بُرا کہہ کے میں کیوں ہوں دشمن کسی کا
شباب آچکا اب کسے دیکھتا ہے | امیر اُٹھ کے ہر بار جوبن کسی کا

مرے پھولوں میں کیا ہے موقع ہنسی کا　　نہ اتنا بھی بے درد ہو دل کسی کا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر　　سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
قطرہ اشک بنے گوہر گوش جاناں　　آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
کونسی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں　　شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

تری سفاکیاں پہنچیں یہاں تک　　کہ ڈرتی ہے حیات جاوداں تک
کڑی ہے اس قدر منزل عدم کی　　کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک
بہار آخر ہے اور میں بے پر و بال　　قفس سے اڑ کے بیٹھے آشیاں تک
ہزاروں حسرتوں کا ہو گیا خون　　کہاں تک پاس رسوائی کہاں تک
کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ　　یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں　　تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں
حشر میں اتنا کہوں گا اس سے میں محروم وصل　　پاکدامن تو ہے میں کیونکر گنہگاروں میں ہوں
زاہد و کافی ہے اتنی بات بخشش کیلئے　　اس کو شوق مغفرت ہے میں گنہگاروں میں ہوں
کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ　　اے اسیران قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

پھول میں پھولوں میں ہوں کانٹا ہوں کانٹوں میں امیر
یار میں یاروں میں ہوں عیار عیاروں میں ہوں

ضبط کرنا دل حزیں نہ کہیں　　چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

کلیاں یہ سرخ سرخ نہیں لالہ زار میں　　مہندی لگی ہے دست عروس بہار میں

پڑ گئی کیا لوٹ یارب گلشن ایجاد میں　　دست گلچیں میں ہے گل بلبل کف صیاد میں

گزشتہ خاک نشینوں کا یادگار ہوں میں　　مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں

نگاہ گرم سے مجھکو نہ دیکھ اے دوزخ　　خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں
زمین قصر سلاطیں سے آ رہی ہے صدا　　کہ آج منزل عشرت ہوں کل مزار ہوں میں
پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے　　گناہگار یہ کہدے گناہگار ہوں میں

بانکی ادا ہے وہ نگہِ خشمگیں نہیں　　غمزہ چھری لئے ہے وہ چین جبیں نہیں

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں سب چھوٹ جاتے ہیں　　جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

شوخی تھی قیامت، تری مستانہ ادا میں　　فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی　　ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار　　سادگی زیور ہے اس سن کے لئے
دختِ رز سی پاک دامن چاہیئے　　شیخ جی سے پاک باطن کے لئے
مجھ سے رخصت ہو مرا عہد شباب　　یا خدا رکھنا نہ اس دن کے لئے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

انتخاب کلام داغ

کیا لطف ستم یوں انہیں حاصل نہیں ہوتا　　غنچے کو وہ ملتے ہیں اگر دل نہیں ہوتا

جس نے ہمارے دل کا نمونہ دکھا دیا　　اس آئینے کو خاک میں اس نے ملا دیا

دیکھ لے گا یہ مزا جنت میں جو جائیگا　　آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائیگا

جب جوانی کا مزا جاتا رہا زندگانی کا مزا جاتا رہا

صبر ے زاہد نا فہم نہ مے خواروں کا بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

گر میرے بت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا اس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا
اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصح مشفق دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا
جب داغ کو ڈھونڈھا کسی بتخانہ میں پایا
گھر میں کبھی اس مرد خدا کو نہیں دیکھا

دونوں دشمن ہیں لستبر کے آسماں ہو یا دمیں فتنۂ گر بالائے سر ہے تو ستمگر زیر پا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا خانۂ عشق بے چراغ ہوا

کیوں صرفہ نگاہ مری جان ہو گیا میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

کوستا ہوں جو نصیبوں کو تو کہتا ہے وہ شوخ پھر محبت نہ کرے گا اگر انساں ہوگا
زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائینگے اب سے وہ کام کرینگے کہ جو آساں ہوگا

سو حسرتیں تو آئیں گیا ایک دل تو کیا ملنا تھا جو مجھے مری قسمت کا مل گیا

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا بلا ہوں میں بھی کہ آئی بلا کو ٹال دیا

ہوا ہے جب سے شہرہ اس عدوئے دین وایماں کا کوئی دل پھیر کر دیکھے عقیدہ ہر مسلماں کا

سر محفل مجھی سے تجکو ظالم پردہ کرنا تھا پھر اس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے منہ ڈھانکا

دل میں تو کفر ترے تجبر غضب خدا کا
اے داغ سوئے کعبہ پھر مانگنا دعا کا

جب راہ سے وہ گذرے ڈالی بنائے محشر
فتنہ بنا نگہباں ہر چشم نقش پا کا

دست ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا
سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

ہے مجکو خبر رات کو جو ترے قریں تھا
میں گرچہ نہ تھا پاس مرا دل تو وہیں تھا

تفرقہ پرواز تھی کیا آنکھ اس صیاد کی
مجھ میں اور دلمیں مرے بلا ہی سو تیر کا

شب فراق جو دست دعا بلند ہوا
ندائیں آئیں کہ باب قبول بند ہوا

نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری
یہ پوچھو تو مسافر تونے کیا لطف سفر پایا

وہ میرا چھیڑنا آغاز الفت میں شرارت سے
وہ رکھکر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا

شمع پر سینک کے تکئے بھی بغل میں دابے
گرم جب بھی تو شب ہجر میں پہلو نہ ہوا

آئینہ تصویر کا تیرے نہ لیکر رکھ دیا
بوسے لینے کیلئے کعبے میں پتھر رکھ دیا

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لیکے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

دی موذن نے شب وصل اذان پچھلی رات — ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

کیا کہوں تیرے تغافل نے حیا نے کیا کیا — اس ادا نے کیا کیا اور اُس ادا نے کیا کیا

راز دل کوئی کہے لاکھ میں کیوں کر اپنا — داور حشر جدا چاہئے محشر اپنا

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں — اُنکی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

جب کہا اور بھی دنیا میں حسیں اچھے ہیں — کیا ہی جھنجلا کے وہ بولے کہ ہمیں اچھے ہیں

حضرت دل آپ ہیں کس دھیان میں — مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں — ہمکو خدا جو صبر دے تجھسا حسیں بنائے کیوں

دست گلچیں سے چھڑا آیا کف صیاد میں — میں گل بازی ہوں کیا اس گلشن ایجاد میں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

رہیگا کوئی تو تیغ ستم کی یادگاروں میں — مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھکو — اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھکو

مجھکو جنت میں نہ راحت ہو گی — گر یہی دل ہے قیامت ہو گی

اس انجمن سے بہت بے وقار ہو کے چلے — سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے

جانِ عالم کی شاعری

حضرت قدر قدرت ابومنصور سکندر جاہ ناصرالدین قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ جانِ عالم علاوہ اور تمام علوم و فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے اور اس میں بہت کچھ گلکاری کی ہے۔ نظم کے ہر صیغے میں دادِ سخن دی ہے۔

یہ ہندوستان کے پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ سمجھا۔ تمام ہندوستان کے مشہور شاعروں سے صحبت گرم رہتی تھی۔ خاص مصاحبین اچھے اچھے نامی شاعر تھے۔ خواجہ آفتاب الدولہ ارشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد قلق فتح الدولہ بخشی الملک میرزا محمد رضا برق۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خاں بہادر اسیر گلشن الدولہ بہار

اس کے علاوہ صحبت مشاعرہ میں منتخب شعرا شریک ہوتے تھے وہ زمانہ اردو شاعری کے شباب کا تھا۔ زبان کے قواعد، محاورات کی پابندی، متروکات کا لحاظ، ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورا تھا۔ پھر معصر شعرا میں شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر وزیر۔ شیخ سیتا عیش۔ کپتان مقبول الدولہ قبول۔ آغا حجو شرف۔ الہ یار خاں سحاب۔ میر جان خاں یکتا۔ میر محمدی سپہر۔ میر امداد علی بحر۔ اصغر علی خاں تسیم۔ میر علی اوسط رشک۔ امیر علی خاں ہلال۔ نواب حسین علی خاں اثر۔ مہدی حسن خاں آباد۔ میر وزیر صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ میر کلو عرش۔ شیخ محمد جان شاد۔ پیر و میر شیخ امان علی خاں سحر۔ ایسے ایسے باکمال استاد فن موجود تھے۔ شاعر تو شاعر امرا میں بھی اس فن کی طرف کمال رغبت پائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی امیر اس فن کے اکتساب سے خالی نہ تھا اور تمام شہزادگانِ والا تبار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صاحب عالم شہزادہ مرزا سلیمان قدر تسخیر۔ جرنیل مرزا فریدوں قدر۔ مرزا ہزبر علی خاں ہزبر۔ کیواں قدر ہمایوں جاہ قیصر حشم ولی عہد مرزا احمد علی خاں بہادر کوکب۔ شرف الدولہ منتظم الملک محمد ابراہیم خاں مستقیم جنگ خلیل۔ راجہ مقیم الدولہ سہر۔ نواب ممتاز الدولہ تاثیر۔ نواب سید محمد

خاں رند۔ فقیر محمد گویا۔ حسین علی خاں جویا۔ راجہ جواہر سنگھ جوہر۔ نواب طالب علی خاں عیشی۔ مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقب۔ نواب عاشور علی خاں عاشور۔ غرض لکھنؤ میں شاعری کا اچھا خاصا باغ لگا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلے۔ اور عجیب عجیب بلبل چہکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بادشاہ کی قدر دانی کے لحاظ سے خاص و عام میں یہ اسپرٹ بھری ہوئی تھی جس کو دیکھئے شاعر جس کو سنئے شاعر۔ دار السلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی۔ اور دہلی کا ٹوٹا ہوا مجمع بھی اُسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا تھا۔

محلات میں تمام بیگمات کو اگرچہ فیاض ازل سے سخن فہمی اور سخن گوئی کا حصہ ملا تھا لیکن بعض بعض بیگمیں زبان اور محاورات کے لحاظ سے نظم کی لڑیوں میں موتی پروتی تھیں ان میں ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف نواب خاص محل صاحبہ عالم کا نمبر سب سے اول تھا ان کی تصنیف سے ایک دیوان بیاض عشاق اور ایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ حضور عالیہ ملکہ اودھ اختر محل نواب رونق آرا بیگم بنت نواب علی نقی خاں تاج النساء نواب معشوق محل صاحبہ، ملکہ جہاں تن افسر النساء، نواب فشاں محل صاحبہ نواب زیب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

شاہ اختر کا شاعری میں سجزنمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا۔ بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لئے ہوئے تھا۔ تحصیل فن کے اعتبار سے عروض میں اردو کی کتاب "جواہر العروض" خود ان کی تصنیف کی ہوئی اور دوسری کتاب ارشادِ خاقانی شاہدین عادلیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کم سے کم علمی مذاق کے ہر شعبے میں ایک نہ ایک تصنیف بادشاہ کی موجود ہے۔ پند و نصائح میں "نصائح اختری" اخلاق میں "مناظرہ بین النفس والعقل" مراثی میں "دفتر غم" مجربات خاص میں "مجموعہ واجدیہ" علم موسیقی کے بیان میں "ناجو"۔ "دلھن اور بنی"۔ مثنویات میں "سرورِ خاقانی"۔ "حزنِ اختری"۔ "دریائے تعشق"۔ "بحر الفت"

"نامجات" و "شقہ جات" میں "ملک اختر" خطابات میں "مثنوی بحر مختلف"۔ عروض میں "جواہر العروض"۔ ارشادِ خاقانی" غزلیات میں چھ دیوان ضخیم اس کے علاوہ

اور بہت سے مختلف فنون کی کتابیں ہیں۔ بادشاہ اگرچہ کسی سے تلمذ نہ رکھتے تھے لیکن طرزِ کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر پکار اٹھتے تھے۔ "خداوندا یہ شاعری نہیں سحر ہے اعجاز ہے"۔ فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے۔

اصنافِ سخن میں صرف قصیدے ایک ایسی چیز ہیں جن کے لکھنے کی بادشاہ کو احتیاج نہ تھی۔ مگر آخر وہ بھی ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں لکھے۔

مرثیوں میں اگرچہ نازک خیالی اور شاعرانہ تخیلات نہیں لیکن احادیث کا ہو بہو ترجمہ اور سادی عبارت کچھ عجب مزا دیتی ہے۔

زمانہ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق ہوا۔ عروض و قافیے کے رسالے ازبر کئے مشکل سے مشکل بحروں میں بغیر کسی کی اصلاح کے موتی پروئے۔ اور مشاعرے میں غزل پڑھی۔

بہت سے سخن فہم شاگرد ہوئے۔ مہتاب الدولہ رخشاں تعیش الدولہ عیش۔ منشی مظفر علی ہنر۔ مرزا محمد عباس شاد۔ لایق الدولہ شاہد اور مشیر وغیرہ وغیرہ کو برسوں اصلاح دی۔ غزل میں جو لفظ بنا یا پتھر کی لکیر ہوگیا۔ جب زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی۔ شعر و سخن کا چرچہ بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے دو منشی تصنیفات کی تحریر پر لازم تھے جملہ تصنیفات کی فہرست انشاء اللہ دہر اضافہ کی جائے گی۔ عہدِ سلطنت کا ذکر ہے منشی امیر اللہ تسلیم نے جو علاوہ شاعر ہونے کے خوشنویس بے بدل تھے۔ ایک عریضہ حضرت ابو المنصور کی خدمت میں نظم میں نہایت خوشخط پیش کیا۔ اتفاق وقت سے حضور کی نظر اس عرضداشت پر پڑ گئی۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے اور بعد ملاحظہ شرح دستخط نظم لکھوائی وہ اشعار یہ ہیں۔

بشنو اے خوشنویس اے خوش گو ہر دو فن مے کنی و ہر دو نکو
اسمِ تو مندرج بہ دفتر شد نسبت و دہ روپیہ مقرر شد

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضور اردو نظم میں قادر الکلام تھے اسی طرح فارسی میں بھی برجستہ فی البدیہ کہتے تھے۔

بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں۔ کہ ان کی شاعری تعریف

کی بوچھار سے کمال کی حد تک نہیں پہنچنے پاتی اور مصاحبین کو بیجا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی۔ مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ان کو یہ شک ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چونکہ خود سخن فہم تھے۔ اسی سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل ان کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی۔ دوسرے اہلِ کمال کا کثیر مجمع آپس کے چشمک سے ہر اک محک امتحان بنا ہوا تھا۔ کوئی لفظ بے محل صرف کیا اور شاعر نظر سے گر گیا۔ ایسا ویسا شاعر تو سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ آتش و ناسخ کی چوٹیں۔ برق اور رشک کی نوک جھونک۔ اکتساب فن کے واسطے کیا کم تھیں۔

ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر شاہیہ پڑھا ؎

اہل جو سر نہیں جھکتے ہیں کسی کے آگے

ٹوٹتی ہے وہی تلوار جو فولادی ہے

حضرت نے بہت پسند فرمایا اور تمام مشاعرے نے داد دی۔ دوسرے مشاعرے میں ان کے حریف نے اسی کے جواب میں ایک شعر کہا جو عام پسند ہوا۔ ؎

نیک و بد سب سے جھک کے ملتے ہیں

دونوں ناکوں پہ تیغ کستی ہے

اسی طرح ہر مشاعرے میں نوک جھونک' اشارتاً و کنایتاً چوٹیں فی البدیہہ اشعار ہوا کرتے تھے اور داد سخن ملتی تھی لیکن جانِ عالم کے تو باوجود مشاغل امور سلطنت کے جو کچھ فرمایا آویزۂ گوش خلائق ہوا۔ ہر غزل مقبول خاص و عام تھی۔

مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی۔ ہر پہلو پر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا۔ پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نورٌ علیٰ نور

ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیاں اور عمدہ تخیل کے سمندر موجزن نظر آئیں گے۔

جزئیات پر خیال کیجیے تو قلیل استعمال قافیے اس شائستہ پہلو سے نظم کیے ہیں جن سے بہتر کہنا غیر ممکن ہے ؎

بندے کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدعِ حقیقتی ہے وہ کل کائنات کا

حمد میں صفات و کائنات کے قلیل الاستعمال قافیے کس عمدہ تخیل کے ساتھ ادا کئے ہیں ؎

ناقوسِ برہمن سے صدائے اذاں سُنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

توحید پرستی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا تھا ؎

جا سے بیجا ہو گئے کس کا رہا مسکن بجا
عشق کی منزل ہو کب ہیں دوست اور دشمن بجا

رشکِ پائے یار سے پامال ہیں اہلِ فرنگ
ٹھوکروں سے اس بتِ خودکام کی ارگن بجا

رہروِ ملکِ عدم کا حال کچھ کھلتا نہیں
اے جرس اس قافلے پر ہی ترا شیون بجا

مذکورۂ بالا اشعار میں خوبیِ معانی اور شوکت کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی ہر ردیف کے جدا جدا معانی پیدا ہوتے ہیں۔ مطلع میں "بجا" کے معنی ٹھکانے کیلئے گئے ہیں۔ یعنی "برجائے خود" دوسرے شعر میں "بجا" نواخت کے معنی پر نظم ہوا ہے تیسرے شعر میں "بجا" درست' اور صحیح کے معنی دیتا ہے ؎

ابرو کا کوئی مجھ پر اب وار نہ ٹھہرے گا
وہ ترک بھی عاری ہے زنہار نہ ٹھہرے گا

کانٹا ترے تلوؤں کا آنکھوں سے نکالیں گے
کھٹکا ہے نگاہوں میں یہ خار نہ ٹھہرے گا

ٹٹ پونجیوں کا اختر میخانے میں دورا ہے
دوکان اٹھا ڈالو بازار نہ ٹھہرے گا

بعض بعض مقام پر رعایت لفظی کو آپ نے صرف کیا ہے لیکن اس میں رعایت معنوی کا خوبصورت پہلو مستتر ہے ؎

ساون کی طرح ہجر میں مینہ آنکھوں سے برسا
بجلی کا پڑا وصل میں کچھ نورِ نظر سا

پایا نہ کوئی جاہِ ذقن دیدہ ترسا
چشموں سے بہت کھینچتے ہیں اشکوں کا چرسا

کس کی نظرِ صاف کی تاثیر ہوئی ہے
اختر کو نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے قمر سا

ولہ

ابلقِ شب کو اگر یار نے موڑا ہوتا
توسنِ عمرِ رواں پر مرا کوڑا ہوتا

بیکلی سے ہوا بیکل ترا نازک شانہ
طفلِ غنچہ کے نہ کانوں کو مروڑا ہوتا

خاص لکھنؤ کی زبان اور محاورات جو بادشاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ بہت معتبر اور مستند ہیں جس موقع پر جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسی پہلو سے نظم کیا ہے۔ مثلاً ؎

ترانہ گل کا جو پیکِ صبا نے سکھلایا
چمن میں نغمۂ بلبل کو میں اُڑا لایا

پر پتنگوں کے جلا کر صبح دم گل کر دیا | بزمِ عالم میں یہی کیا شمع کا محصول تھا

زندگی تخت پہ کی مر کے گئے قبر میں شاہ | فکرِ آغاز میں ہوتا ہے یہ انجامِ نصیب
بدنِ صاف پہ رنگینی دکھاؤ صاحب | قول ہارے ہو تو گل چلو نکے کھاؤ صاحب
کہیں تارِ نظر بد نہ نزاکت پہ پڑے | بال کی اوٹ میں جاتے ہو تو جاؤ صاحب

وہاں مہتاں لب پر ہے دھواں غم کا یہاں دل میں | جلے گا چنبر گردوں حسینوں ان قرینوں پر
روتا ہوں مرا اشک ہے قلزم کے برابر | خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

بعض بعض اشعار سے آپ کی طرزِ معاشرت و علوے ہمت کا پتہ بھی چلتا ہے۔

مذمت زر پرستی

بھیجتی ہے زنِ حاملہ کی زرجو رکھے دوست | تھیلی کا یقیں صاف ہوا مجکو دنی پہ

نوشتۂ تقدیر

یہ عشق ترے حسن سے قسمت میں لکھا ہے | افسوس نہیں چاہیئے ہم کو شدنی پہ

نکالوں کس طرح دل سے ترے زخم لگانے تیروں کو | مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

غم پیری

دل بھی کمھلاتے ہیں جوں جوں بال ہوتے ہیں سفید | بلبلیں بھی سیر ہوں موسم ہے پت جھڑ کا اگر

اے جوانو اب ضعیفی ہے ہماری ان دنوں | پھینک دیتی ہے ہمیں باد بہاری ان دنوں

پابند علایق

فقط دل سے ہیں اے اعضائے رئیسہ | کرے سلطان نہ آزادی کی خواہش

مذمت دنیا

ترک ہے دنیائے دوں کنج قناعت ہے قبول | یہ زنِ قحبہ ہے اختر کیا چھنالوں سے غرض

عیشِ دنیا بزمِ غم اندوز ہو | رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو

عشق حقیقی

کچھ نہیں اختر مجھے عشقِ مجازی سے حصول
اتبو معشوق حقیقی سے ہے اپنا اختلاط

جو معشوق حقیقی ہے مجھے اسکی غلامی ہے
وہ آقا ہے کہ سر نامہ چمن کا نام نامی ہے

تعریف سخن

یہ شاعری ہے نسخۂ اکسیر سے سوا
اب میں چھپاؤں خاک ہوا سب ہیں منکشف

مرے مضمون عروس شب میں زیور سے بجیلے ہیں
وہ شاطہ ہوں میں میرے سبب سب نکیلے ہیں

اختر یہ فقط زور طبیعت ہے دکھانا
اشعار کا انداز ہے نو طرز مرصع

خضوع و خشوع

ہم نمازوں میں جو بے آس کھڑے رہتے ہیں
سامنے چشم کے وسواس کھڑے رہتے ہیں

کیوں نمازوں میں نہ زاہد حسن کا مشتاق ہو
ایسی کب تکلیف دی ہے عشق نے جو شاق ہو

توحید

چشم وحدت میں وہ معشوق جو لاثانی ہے
حلقۂ چشم بھی اک خانۂ سلطانی ہے

شاہد اصلی مجھے مقصود ہے
کعبۂ دل میں وہی معبود ہے

دونوں صنعے ہیں تری وحدت پہ دال
جب دوئی سے ان کو دیکھا فرد ہے

وہ جو معشوق حقیقی حسن میں موصوف ہے
عشق میں عاشق بھی اسکا شہر میں معروف ہے

تجرد

دفتر عالم میں بس وہ فرد ہے
جو مجرد اس چمن میں مرد ہے

مختلف مضامین

مے رنگیں پہ لاکھوں کاسہ سر چڑھ رہوتے ہیں
رُخ ساقی سے یہ بلنوش سب مخمور ہوتے ہیں

پردہ نشیں سمائے دل ناشناس میں | آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

تولد تجھ اخمی ہو بد فرزند کے بدلے | اٹھالے باپ کو یارب نساد تمنا کے بدلے

رکعتوں میں زاہدا آتی تجھے تشکیک ہے | وسوسہ ہوئے میان یار سے باریک ہے
ڈھونڈھ لائیں گے سیہ بختی میں ہم تار نظر | مشعل مضمون سے روشن کو شک تاریک ہے

اگر محراب ابرو بت کی ہو تو آنکھ ساحر ہو | مسلمانی بظاہر ہے مگر باطن میں کافر ہے
کھلے گی تختۂ کاغذ یہ سرخی خون شاعر کی | قلم تیغ مضامیں سے یہ سر ہو جائے حاضر ہے

گو یہ گنجینہ جواہر و زواہر شباب کی شاعری کا ایک مختصر انتخاب لآلی دُر شاہوار سے کم نہیں لیکن اگر زمانے نے مہلت دی تو آئندہ "دیوان قمر مضموں"۔ "دیوان مبارک" "دفتر ہمایوں"۔ "دفتر پریشاں" "سخن اشرف"۔ "کلیات اختری" کا انتخاب لکھا جائے گا۔

زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف کا قلمی ذخیرہ جس کو سلطان عالم خزینۂ زر و جواہر سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر میں گم ہو گیا۔

مثنویات میں "سرور خاقانی" ایک ایسی مثنوی ہے جس میں بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگذشت لکھی ہے اور واقعات کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ ممنوعہ بیگیات کے ابتدائی تعلقات اور متعہ کے قصہ طلب واقعات کو بالتصریح نظم فرمایا ہے۔

افسوس ہے ذی ہنر، قدردان اہل فن، اکمل دوراں، سخن سنج، عادل، غریب پرور، رحمدل، بادشاہ، گلشن ہند کا بلبل ہزار داستان، لکھنؤ کا راجہ اندر، فریدوں فر جمشید قدر سکندر بخت نوشیرواں زماں دفعتہً اپنے تخت و تاج سے جدا ہو کر کلکتے کے "مٹیا برج" میں "امام باڑہ سبطین آباد" کی مختصر قطع زمین پر غربت اور بیکسی کی میٹھی نیند سو رہا ہے جہاں سوائے مصیبت کے کوئی فاتحہ خیر پڑھنے والا نظر نہیں آتا۔ اور یہ کیونکر یقین آئے کہ مرنے کے بعد ان کو دنیا کے تمام جھگڑوں سے نجات ہو گئی اور وہ کنج مرقد میں عیش سے آرام پذیر ہوں۔ کیونکہ ؎

بھلا کیا خاک آئے چین اُس کو کنج مرقد میں | رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوش نازنین برسوں

مشاہیر شعرا کے مزار

میں اہل دہلی کا اس بات میں معترف ہوں کہ ان میں بیداری پیدا ہو چلی ہے وہ اپنے تاریخی روایات کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اور پرانی یادگاروں کی قدر کرتے ہیں۔ آج کل لوگوں کو غالب کے مزار کی فکر دامن گیر ہے۔ اور سب طرف سے آوازیں آرہی ہیں بہ خلاف اس کے ہمارے بے فکر لکھنؤ کو دیکھئے جیسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں وہی آزادی وہی بیفکری ہے۔ جو شاہی میں تھی۔ اگر غور کیا جائے تو ایسی یادگاروں کے قایم کرنے کی زیادہ ضرورت لکھنو میں ہے جہاں کی سرزمین پر دہلی کے مایۂ ناز شاعر محو خواب ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں انشا اسی خاک میں مدفون ہیں خیر ان کے مزار کا پتہ تو اب تک موجود ہے۔ اور ان کی نسل بھی باقی ہے ان کا مزار آئینہ بی بی کے باغ میں ہے۔ انشاء اللہ خاں کے بیٹے ماشاء اللہ خان تھے۔ جن کے پوتے ہدایت اللہ خاں ابھی تک بقید حیات تھے۔ یہ بڑے باکمال منجم اور شاعر بھی تھے۔ فراشخانہ میں رہتے تھے۔ حال میں انتقال ہوا ہے۔

میر تقی ہوس کا مزار بھی اب تک برائے نام موجود ہے اور ان کا دیوان قلمی بھی ان کی نسل کے لوگوں کے پاس دیکھنے میں آیا ہے۔

میر محمدی سوز کے مزار کو میں نے بہت تلاش کیا اور لوگوں سے دریافت کیا مگر اب تک پتہ نہ ملا۔ یہ بھی لکھنو کی سرزمین میں سو رہے ہیں۔ ان کا دیوان مکمل میرے پاس موجود ہے۔ سعادت یار خاں رنگین کے قلمی پانچ دیوان اور کچھ نثر کی کتابیں میری نظر سے گذریں لیکن ان کے مزار کا صحیح پتہ نہ معلوم ہوا۔ نہ اولاد کا پتہ چلا۔ نواب طالب علی خاں بہادر عیشی اردو اور فارسی میں بالکل غالب تھے۔ ان کی نظم اور نثر دیکھنے کے قابل ہے اردو کا دیوان سبحان اللہ دہلی کی شان اور غالب کا رنگ فارسی آمیز۔ فارسی کے دیوان میں نظیری کا رنگ یہ بھی لکھنؤ میں دفن ہیں۔ مگر مزار نامعلوم جگہ میں ہے۔

شیخ قلندر بخش جرأت دہلی کے مشہور شاعر تھے آخر میں نواب محبت خاں کے مصاحبوں میں نوکر ہوئے تھے اور حضرت عباسؑ کی درگاہ کے قریب رہتے تھے۔ ان کی قبر کا پتہ لگانے

کے لئے میں بہت سرگرداں رہا۔
نواب محبت خاں کے پوتے نواب چھنداامیاں قمر نے کہا دیکھئے ان کی کچی قبر اسی جگہ پر تھی یہاں ایک کچا مکان تھا جس میں ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔ میاں جرأت اسی میں رہتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی جب ان کا انتقال ہوا تو لڑکی نے اسی مکان میں باپ کو دفن کیا اور دو چار برس کے بعد باپ کے غم میں وہ غریب بھی مرگئی۔ اب نہ قبر ہے نہ نشان قبر نہ مکان ہے نہ چھپر ایک افتادہ میدان ہے۔ لڑکی کی بھی قبر اسی جگہ تھی۔
میر حسن کی قبر کا نشان ابھی تک باقی ہے۔ میر خلیق کی قبر بھی معلوم ہے۔ میاں جرکین بھی دہلی کے رہنے والے اور اپنے رنگ کے اچھے کہنے والے تھے۔ جرکین مصحفی کے زمانے میں موجود تھے "وزیر گنج" میں میاں مخمور شاگرد مصحفی کے پاس آیا کرتے آدمی یار باش اور برجستہ گو تھے۔ حاضر جواب بذلہ سنج ان کے مزار کا پتہ لوگوں نے بتایا ہے۔ مگر میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔
میر جعفر زٹلی بڑے مرتبے کے شاعر خاص دہلی کے باشندے بذلہ سنج لطیفہ گو خوش رو چھریرا بدن ظریف اپنے رنگ کے فرد تھے ان کا دیوان چھپ چکا ہے لیکن مزار کا اب تک پتہ نہیں لگا۔ نہ اولاد میں کوئی باقی ہے۔
میر صاحبقران یہ مارہرہ کے رہنے والے سید شریف النسب تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے۔ بہت قدر دانی کی گئی۔ دہلی کے مقلد تھے بہت پُر مذاق ہزل گو، ظریف پھبتی برمحل کہتے تھے۔ ان کے ایک نواسے سید حسن عسکری نابینا حکیم زندہ ہیں باوجود تنگدستی و افلاس کے وضع کے پابند حد کے منکسر مزاج مزار کا پتہ اب تک نہیں ملا۔ ان کا دیوان قلمی ملا ہے اور بہت سے دہلی کے مشہور شاعر ہیں جن کا میں بالتفصیل آئندہ ذکر کروں گا۔
اس وقت دہلی کے دو آفتاب و مہتاب کا ذکر کرنا ہے جن کے مزار کا نشان تک، کچھ دنوں کے بعد نہ رہے گا۔ اول ملک الشعرا مرزا رفیع السودا یہ سب کو معلوم ہے کہ مرزا سودا دہلی کے روح رواں تھے ان کی نسل میں کچھ لوگ ہیں مگر مجھے پورا حال نہیں معلوم ہوا۔ قبر "آغا باقر کے امام باڑے" میں ہے۔ مگر گمنامی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ کوئی کتبہ ہے نہ نشان دوسرے ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی اکبر آبادی یہ وہ شاعر ہیں جن کا نام تمام ہندوستان میں آفتاب

کی طرح مشہور ہے نازک دماغ شاعر تھے۔ تمام ہندوستان ان کی زبان، ان کے کلام سے فیض اٹھاتا اور انہیں کی زبان پر فصحا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ آج ان کا کلام زبان اردو کا قانون ہے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تو "مفتی گنج" میں رہتے تھے پھر "میاں الماس" کے امام باڑے میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے ایک فرزند تھے جن کا نام سید حسن عسکری عرف میر کلو تخلص عرش تھا جب مرنے لگے تو اپنے بیٹے سے کہا کہ "تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولت دنیا میں سے تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو اور اگر ہوتی بھی تو قابل فخر نہ تھی۔ ہاں کچھ زبان اردو کے متعلق علم سینہ ہے۔ جو ہمیں بمشورہ ماموں سراج الدین خاں آرزو کے خدا نے عطا کیا ہے۔ اور اسی کے بھروسے پر ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا اور انہیں معلومات پر شاہی درباروں میں ہماری عزت و تکریم ہوئی۔ میں نے ان کو تمہارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ لیا ہے۔ اس کتاب کا نام "اصول اردو" ہے۔ زبان کی حفاظت کے لئے یہ قواعد کافی ہیں ان اصول پر کاربند ہوگے تو اردو ایک دن بام ترقی پر قدم رکھیگی۔ اور یہ وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ مجھے تمنا تھی کہ خدا مجھے پوتا عطا کرتا۔ وہ اب تک پوری نہ ہوئی۔ شاید میرے بعد خدا تم کو بیٹا مرحمت کرے تو اسے تعلیم دینا اور یہی کتاب یاد کرا دینا۔ اور اس کے مطالب سمجھا دینا۔ اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ امانت تفویض کر دینا"

ملک الشعرا کو انتقال کئے ہوئے آج تخمیناً سو برس ہوئے۔ ان کے بعد عرش مرحوم کو بڑی بڑی معرکہ آرائیاں پیش آئیں۔ سب سے پہلے ناسخ مرحوم سے ان سے چوٹ چلی۔ ناسخ کا زمانہ موافق تھا۔ اور تمول حاصل تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کو بھی اپنا شاگرد کہہ دیا کرتے تھے۔ یہی سلوک میر صاحب کے ساتھ بھی کیا۔ میر کلو عرش تنک مزاج شاعر تھے۔ ان کو ایسی باتوں کی کہاں تاب تھی۔ ناسخ کے اس کلام سے برہم ہوگئے ہر چند ناسخ مرحوم نے معذرت کی۔ پذیرا نہ ہوئی۔ اس دن سے خانہ نشیں ہوگئے۔

ایک شخص ذکی الطبع وجیہ شاگرد ہونے کو آئے ان کا تخلص انسخ رکھا۔ انسخ نے ناسخ پر بہت چوٹیں کیں اور بعض اعتراضات کئے جو آج تک زبان زد خلائق ہیں۔ مگر آخر میں انسخ اعتراضات سے دست کش ہوئے۔ اور آپس میں صفائی ہوگئی لیکن میر کلو عرش مدت العمر نہ ملے۔ افلاس، غریبی، فلاکت جو ان کا میراث پدری تھا۔ ان کو بھی ملا۔ آخر میں لکھنؤ کے

روسا کی صحبت میں افیون پینے لگے۔ افیون نے ان کو بہت مٹا دیا۔ ناسخ کے کچھ دنوں کے بعد ناسخ کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد عرش کے چار شاگرد اور تھے میر سرفراز علی قمر، شیخ فدا علی عیش، منشی فلک۔ شیخ محمد جان شاد پیرو میر لکھنوی

شاد پیرو میر استاد کی بہت خدمت کرتے تھے۔ اور مرد مجرد تھے۔ شاعری کے انتہائی شوق میں آپ نے اپنا عقد نہیں کیا۔ تنک مزاج بہت تھے۔ مہذب انتہا کے میر تقی میر کے آخر وقت میں یہ شاگرد ہونے گئے۔ تو میر صاحب نے ان کو میر کلو عرش کے سپرد کیا۔ میر کلو نے تو ان پر بہت محنت کی اور ان کو بھائی کہتے تھے۔ یہ ہر وقت حاضر باش رہتے تھے۔ جب میر کلو میاں الماس کے امام باڑے سے اٹھکر "رکاب گنج" میں آئے تو کتاب "اصول اردو" شاد پیرو میر کے سپرد کی اور کہا "میر صاحب قبلہ مرحوم کی نصیحت تھی کہ اس انمول جواہر کو اولاد یا قابل شاگرد کو دینا اولاد تو میں رکھتا نہیں اور شاگرد تم سے زیادہ قابل کوئی نہیں اس لئے کہ لکھنؤ کی زبان سے تمام شاعر متاثر ہوئے مگر تم نے دہلی کے طرز شاعری اور دہلی کی زبان کو نہیں چھوڑا اور میر کے صحیح پیرو تم ہو۔ اب یہ امانت تم کو سونپی جاتی ہے۔ تم کو اختیار ہے اپنے جس شاگرد کو قابل یا لائق دیکھنا اسے دینا۔ کچھ زمانے کے بعد میر کلو عرش کا بھی انتقال ہوگیا اور "رکاب گنج" دال کی منڈی میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۱۵ھ میں ہمارے استاد شیخ محمد جان شاد پیرو میر کا انتقال ہوگیا۔ یہ "فاطمین" میں دفن ہوئے۔

اب کوئی اتنا بتانے والا نہیں ہے کہ میر تقی میر کی قبر کہاں ہے۔ اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ معتبر لوگوں سے اتنا پتہ ملا کہ ایک میدان میں صرف قبر کا کچھ نشان باقی ہے عجب نہیں کہ دس پانچ برس میں یہ بھی مٹ جائے۔ کوئی ان امور کی بابت توجہ نہیں کرتا۔ اردو کی انجمنوں کا فرض تھا کہ ایسے لوگوں کے مزاروں کو قایم رکھیں۔ مگر کسی نے آج تک توجہ نہ کی مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی ہے کہ پورا وقت اس تلاش میں صرف کروں صرف اتوار کے روز کبھی کبھی مقابر کی طرف جاتا ہوں اور جن مزارات کے پتے ملتے ہیں اور کچھ کتبے ہوتے ہیں ان کی نقل کر لیتا ہوں۔ اگر مقتدر اصحاب اس طرف توجہ کریں۔ اور اپنے مصارف سے ایک آدمی مقرر کر دیں کہ وہ مشاہیر دہلی کے مقابر ڈھونڈھ کر ان کے مزارات کی تعمیر کردے

۵ لکھنؤ میں درگاہ حضرت عباسؑ کے قریب یہ روضہ واقع ہے

تو مناسب یادگار باقی رہے۔ لکھنؤ میں دہلی کے سیکڑوں غالب دفن ہیں۔ لوگ ایک ہی غالب کو رو رہے ہیں۔ سردست یہ انتظام ہونا چاہیئے کہ میر تقی میر اور سودا کی قبریں پختہ بن جائیں اور باقی شعرا کے مزار کی تحقیق کی جائے۔ ابھی تو دہلی کے بہت سے شعرا کی قبریں تلاش کرنا ہیں۔ اس کے بعد لکھنؤ کے مشاہیر کی قبروں کو قایم رکھنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ آتش مرحوم کی قبر ایک مکان میں شامل کر لی گئی ہے جس کا ملنا اب ذرا مشکل ہے۔ پھر غیر ممکن ہو جائیگا۔

شعرا کے مزار

شہر خموشاں ایک ایسا عبرت خیز اور درد انگیز مقام ہے جس کو دیکھکر بے ساختہ آدمی کا دل بھر آتا ہے۔ اس خاک میں ایسے ایسے نازنین مہ جبین۔ ایسے ایسے ذی وقار بادشاہ ایسے ایسے مدبر وزیر۔ ایسے ایسے عقلمند حکما۔ ایسے ایسے روشن خیال شاعر سو رہے ہیں۔ جن کے نام سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جن کا رُعب داب بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن آج وہ ڈھیروں مٹی میں تپے ہوئے ہیں اور ان کی ہڈیوں تک کو ظالم زمین نے کھا لیا۔ حقیقت میں زمین تو آسمان سے بھی زیادہ ستمگر نکلی۔ وہ غریب تو زندوں کا دشمن ہے اور یہ مردوں سے بدلہ لیتی ہے۔ اور اس قدر گمنام کر دیتی ہے کہ مزار تک کا نشان نہیں رہتا۔

عام لوگوں کو تو جانے دیجئے۔ خاص لوگوں کے مزار کے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔ انہیں میں ان لوگوں اور مخصوص شعرا کو لیجئے جو ہندوستان کی زمین پر اپنا ڈنکا بجا گئے ہیں۔ وہ مشاعرے کو درہم و برہم کر دیتے تھے۔ جن کی تعریف میں چھتوں کی چھتیں اڑ جاتی تھیں۔ ہمیشہ مشاعرے جن کے ہاتھ رہتے تھے۔ جو حاصل طرح غزل لکھتے تھے۔ جو ہمیشہ نیا مضمون باندھتے تھے۔ جن کے شعر میں اک نہ اک بات تازہ ہوا کرتی تھی۔ جو مرثیہ گوئی میں سرنام تھے۔ جو منبر پر بیٹھتے ہی لوگوں کو رُلا دیتے تھے جن کا رقص منبری مطبوع عام تھا جن کی آواز میں لحن داودی کا اثر تھا۔ آج ان کے مزاروں کا پتہ لگانا بھی ہم کو دشوار ہے۔

مثل مشہور ہے کہ دنیا مردہ پرست ہے لیکن ہندوستان کی دنیا نہ مردہ پرست ہے نہ زندہ پرست۔ بات یہ ہے کہ ابھی ہندوستانیوں میں اپنی مادری زبان کے تحفظ کا ذوق و شوق پیدا نہیں ہوا ہے۔ ورنہ وہ اپنے سلف کے آثار کو اس طرح نیست و نابود نہ کر دیتے۔ مگر جلدی ایک زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ اپنے سلف کے نشانات ڈھونڈھینگے اور ان کے کارناموں کو ایک ایک سے پوچھیں گے۔ اور کوئی بتانے والا نہ ملے گا۔

جس طرح آج شکسپیر کا ترانہ انگلستان میں ایک ایک فرد کی زبان پر ہے اسی طرح

ہم بھی میر تقی میر مرحوم کے ایک ایک مصرع کو آنکھوں سے لگائیں گے اور ان کی نسل کو ڈھونڈیں گے اور ان کی خاک کے لئے تمام لکھنؤ کی خاک چھانیں گے۔ غضب یہ ہے کہ دہلی والوں نے بھی اپنے غربت نصیب مسافروں کو بے وطن ہونے کے بعد نہ پوچھا کہ وہ کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ کم از کم یہ تو ہوتا کہ غریبوں کی یادگار میں ان کا مزار بنوا دیا ہوتا۔ لکھنؤ والوں سے یہ شکایت ہی بیجا ہے۔ انہوں نے اپنے وطن کے شاعروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جو غریب الوطن ان سے توقع رکھتے۔ ابھی تک لکھنؤ میں آتش کے دیکھنے والے زندہ ہیں۔ مگر آتش کی قبر کا نشان اُن کو بھی معلوم نہیں۔ خلیل لکھنوی کو چار دن مرے ہوئے گذرے۔ اُن کے متعلق ایک ماسٹر صاحب نے بیان کیا کہ اُن کی قبر مراد آباد میں ہے۔ اور ان کا اصلی وطن وہی تھا۔ مراد آباد سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ یہاں مزار کا پتہ نہیں ملتا۔ زیادہ تحقیق سے ایک میر صاحب نے فرمایا خلیل کو ہم نے دیکھا تھا۔ نواب نادر مرزا صاحب ساکن "نواز گنج"[ع۲] کے داروغہ تھے۔ "مصاحب گنج" میں "ہزارا" کے باغ کے قریب رہتے تھے۔ پوچھا قبر کہاں ہے کہا یہ تو معلوم نہیں۔ مگر غالب گمان یہی ہے کہ لکھنؤ میں ہوگی۔ اب بتائیے اس تحقیق سے کیا کام چل سکتا ہے۔ میرا قصد یہ ہے کہ لکھنؤ دہلی کے اساتذہ کے مزارات کا نشان ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لکھوں اور اگر خدا مجھے توفیق دے تو ان کے مزاروں کے قیام کی فکر کروں اس لئے میں اپنی تحقیق کو تحریر میں لاتا ہوں۔ اس بحث میں کچھ صحیح صحیح پتہ معلوم ہو جائیگا میں ایسی تحریک میں کسی سے مدد مانگنے کو ہمیشہ سے بُرا سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کرنا ہو خود کروں۔

مصحفی کے مزار کا پتہ غالب گمان یہ ہے کہ "امروہہ"[ع۱] میں ملجائے۔ سنا گیا ہے کہ وہاں ان کی نسل میں دو ایک آدمی موجود ہیں۔ دوسری غرض اس تحریر سے یہ بھی ہے کہ شعرا کے مزاروں کا پتہ تاریخوں میں درج رہے ممکن ہے کہ اس کام کی آرزو ہمارے دل سے نہ نکلی۔ تو دوسرے لوگ اسے پورا کریں گے۔

نواب عاشور علی خاں عاشور "معالیجاں"[ع۲] کی سرا میں رہتے تھے مصحفی کے اچھے

ع۱ امروہہ ضلع مراد آباد

ع۲ یہ لکھنؤ کے محلوں کے نام ہیں۔ جو شاہی میں بہت آباد تھے۔

شاگردوں میں تھے۔ بہت سے لوگ ان کے شاگرد تھے۔ اُستاد گر مشہور تھے۔ ان کی قبر معالیخاں کی سرائے میں "پیر بخارا" کے تکیے میں سُنی جاتی ہے۔

میر تقی ترقی۔ بہت مشہور شاعر تھے۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ "میر" تخلص کرتے تھے لیکن جب ملک الشعرا میر تقی میر لکھنؤ میں آئے اور ان کی شہرت نے ترقی کرلی۔ تو آپ نے سوء ادب سمجھکر اپنا تخلص بدل ڈالا۔ اور "ترقی" کر دیا۔ آپ کے تین دیوان ضخیم میری نظر سے گذرے۔ پُرگو تھے افسوس ہے کہ ان کا کلام نہیں چھپا۔ ان کی قبر "مصری کی بغیا" میں ہے۔

میر جعفر علی حسرت۔ اُستاد جرأت ابتدا میں فیض آباد آئے۔ اور نواب شجاع الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے۔ اور بہت سے قصیدے ان کی شان میں لکھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں بادشاہ کے ساتھ چلے آئے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں مشکل ردیف قافیوں میں قصاید لکھے۔ ان کے دو دیوان غزلوں کے اور ایک دیوان قطعات کا۔ ایک دیوان رباعیات کا۔ ایک دیوان قصاید کا۔ ایک مثنوی۔ ایک دیوان مخمس۔ میری نظر سے گذرا۔ قصاید بہت مشکل زمینوں میں لکھے ہیں۔ قصاید میں ان کا مرتبہ مرزا رفیع السودا سے کم نہیں ہے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے دربار میں ان کی بہت عزت تھی۔ صاحب استعداد تھے ۱۲۰۷ھ میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ قبر ان کی مفتی گنج میں ہے۔

حشمتی۔ دلی کے رہنے والے شاعر تھے۔ میر تقی کے پاس دلی سے آئے۔ ان کے شاگرد ہوئے اور تا زندگی لکھنؤ میں رہے۔ زبان سیکھنے کی لالچ میں استاد کی خدمت کرتے رہے۔

چند اشعار درج ذیل ہیں۔

قد موزوں ہے تیرا رشکِ شمشاد — کہیں کا ہے غلام اک سروِ آزاد
قفس میں بال و پر باقی ہیں اب تک — بہار آئی ہے اب تو چھوڑ صیاد
دھڑکتا دل ہے یارب خیر کیجیو — کہ اب قاتل نے مجھکو کیوں کیا یاد

تم شوق سے جا بیٹھو اغیار کی صحبت میں — لو ہم تو چلے یاں سے اے یار خدا حافظ
محشر میں یہ بولیں گے سب رند کہ نکلا ہے — حشمتی کے گناہوں کا طومار خدا حافظ

---

۵۷ یہ لکھنؤ کا غیر آباد محلہ ہے۔ شاہی میں بہت آباد تھا۔ اب صرف کربلا اور قبرستان ہے۔ مولف

لکھنؤ میں عہد ناسخ میں انتقال کیا۔ مزار کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

محتشم ایک مشہور شاعر تھے۔ دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ شاگردی کا حال نہیں معلوم ہوا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سودا کے تلامذہ میں ہونگے۔ اس لئے کہ ان کے کلام میں اضافتیں زیادہ ہیں۔

کیوں نہ پیسے مجھے ہو کر مرا دل دو ٹکڑے آسیا بنتی ہے ہو جائے جو سل دو ٹکڑے
بیت بخشی ہو یہ ابرو کی کہ بس تے ہو جائے ہو اگر یار کے رخسار کا تل دو ٹکڑے
اڑ گئے صندل و کافور کے پھائے جلکر تپش قلب نے کی صبر کی سل دو ٹکڑے

بیت بخشی شاید قدمائے دہلی کا محاورہ ہو۔ آج کل لکھنؤ میں بیت بازی بولتے ہیں محتشم کے نام اور مزار کا پتہ نہیں ملا۔

مرزا جعفر علی فصیح۔ مرثیہ گو مشہور تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عروج پایا۔ اور آخر وقت کربلائے معلی جاکر انتقال فرمایا۔

میاں دلگیر مرثیہ گو پہلے ہندو تھے۔ قوم کے کائستھ لالہ شیو پرشاد کے عزیز تھے۔ ان کے محلے میں رہتے تھے۔ اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ مرثیہ گویوں میں سرنام ہوئے سنہ ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی

در گلشن خلد با جمیع شہدا گشتہ یا بوس مرثیہ گو دلگیر
تاریخ وفات او نوشتم اے رشک آہ افسوس مرثیہ گو دلگیر

سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی کسی کربلا میں ان کی قبر موجود ہے۔

میر ضمیر۔ نامی مرثیہ گو تھے۔ مفتی گنج میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی قبر "مفتی گنج" میں خام موجود ہے۔

میر ببر علی انیس ابن میر خلیق بن میر حسن۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ ابتدا میں غزلیں بہت کہیں۔ سنہ ۱۲۹۲ ہجری میں انتقال کیا۔ شاہ سیر میر نے تاریخ انتقال لکھی ہے۔

مرثیہ گو انیس سحر بیاں زیں جہاں رفت شد بہشت مقام
بے سروپا شام شد بے سال خرد مصرعہ چہ مرثیہ جیہ سلام

ان کا مزار بے مرمت موجود ہے۔ ۹۲ ۱۲ ہجری

مرزا سلامت علی دبیر۔ نامی مرثیہ گو تھے۔ ان کا مزار "مرزا دبیر کی گلی" میں ہے ۱۲۹۲ھ
میں انتقال فرمایا۔

سید حسین مرزا عشق۔ مشہور مرثیہ گو تھے۔ "رکاب گنج" میں مکان تھا۔ تھوڑا زمانہ
ہوا انتقال فرمایا۔ مزار "رکاب گنج" میں ہے۔

خواجہ محمد علی جوشش ابن خواجہ حیدر علی آتش ۱۲۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔ رشک نے
تاریخ انتقال لکھی ہے۔

بنزد پدر رفتی افسوس حیف

شاہ یقین۔ دہلی کے پرانے شاعر تھے۔ میر انشاء اللہ خاں کے ہمعصر تھے۔ دہلی سے لکھنؤ
میں آئے۔ مظہر کے شاگرد تھے۔ غزل برجستہ کہتے تھے۔ پانچ شعر سے زیادہ غزل کبھی نہیں
کہی۔ ایک مطلع درج ذیل ہے۔

کون کر سکتا ہے۔ اس خلاق اکبر کی ثنا
نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا

لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مزار کا پتہ نہیں ملتا۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی شاگرد میر تقی میر۔ مدت تک لکھنؤ میں رہے۔ آخر عظیم آباد
واپس گئے۔ پیر کے دن ۳۰ تاریخ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ میں انتقال فرمایا۔ اور وہیں
دفن ہوئے۔

شاہ مظلوم۔ دہلی کے شاعر تھے۔ میر کے شاگرد تھے ۱۲۵۶ھ میں انتقال
فرمایا۔ قبر کا نشان نہیں معلوم کسی نے تاریخ انتقال کہی ہے۔

ہائے افسوس وائے مظلوم است

میرزا تقی خاں ہوس۔ دہلی کے مشہور شاعر تھے۔ ابتدائے شاعری میں لکھنؤ چلے آئے
تھے۔ یہاں نام پایا۔ "مفتی گنج" میں رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا۔ قبر ان کی "مفتی گنج" میں
ہے۔ اور بعض ان کے خاندان کے لوگ موجود ہیں۔

محشر ریختی گو دہلی کے رہنے والے۔ دبلے پتلے نازک اندام۔ خاندان شاہی سے تھے۔
شعر خوب پڑھتے تھے۔ اور سامعین کو ہنسا دینا اور رلا دینا۔ اُن کا ادنیٰ سا کام تھا۔ ایک
شعر اُن کا لکھا جاتا ہے۔

محل میں بھیجتے ہیں، ماں، بہن کو بھیا کیلئے
زبانی شیخیاں محشر ہیں اونچی ناک والوں کی

لکھنؤ میں بہت دنوں تک قیام رہا۔ شیخ قدا علی عیش اور منشی دیا کرشن ریحاں کے جلیس تھے لیکن متفکر اور کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ آخر نہ معلوم کس طرف نکل گئے۔ اور کہاں انتقال ہوا۔

نواب مرزا شوق۔ لکھنؤ کے رہنے والے مشہور شاعر تھے۔ ان کی چار مثنویاں مشہور ہیں۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مزار کا پتہ نہیں معلوم ہوا۔

شیخ فضل احمد کیف شاگرد میر وزیر صبا و خواجہ آتش "سبزی منڈی"ؔ میں رہتے تھے اور مرد نجر و تھے۔ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ "عیش باغ"ؔ میں دفن ہوئے۔ ان کا ایک مطلع ہے۔ ؎

بُت پرستی پہ جو اپنا دلِ ناشاد آیا
سنگریزوں میں نظر حسنِ خداداد آیا

قبر کا نشان موجود ہے۔

عیسیٰ خاں تنہا۔ دہلی کے رہنے والے لکھنؤ میں مشہور ہوئے اور یہیں انتقال کیا۔ قبر کا نشان نہیں ملتا۔

امیر علی خاں ہلال شاگرد میاں برق "پار" میں رہتے تھے۔ اور "جلاجل" نواز تھے شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ قبر گنو گھاٹؔ پر بنی جاتی ہے۔

میر فلک۔ شاگرد عرش مرحوم مشہور شاعر تھے۔ ۔۔۔ میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کی کسی کربلا میں دفن ہوئے۔ ایک مطلع درج ہے ؎

دلِ تپاں ہے برہمِ دلبر کا مکاں ملتا نہیں
طائرِ قبلہ نما کا آشیاں ملتا نہیں

؎ لکھنؤ میں چوک کے پاس یہ محلہ ہے۔ مولف

؎ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ بہادر نے یہ باغ بنوایا تھا۔ ساون میں مشہور میلے ہوا کرتے تھے۔ ادنیٰ طور پر اب بھی ہوتے ہیں۔ یہ باغ ویران ہو کر قبرستان کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ ؎ دریا گومتی کے کنارہ یہ گھاٹ مشہور ہے۔

سید سرفراز حسین قمر لکھنوی تلمیذ عرش مرحوم لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ قبر کا نشان نہیں معلوم ہوا۔ ایک مطلع درج ہے۔

دلِ دردآشنا ڈوبا جو دریائے محبت میں
حصارِ عافیت گرداب کو سمجھا مصیبت میں

آغا حیدر افسوس۔ رئیس لکھنؤ شاگرد اسیر "آغا میر کی ڈیوڑھی" پر رہتے تھے۔ باوضع رئیس تھے تخمیناً تیس برس ہوئے انتقال فرمایا لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ قبر کا نشان نہیں معلوم۔ ایک مطلع درج ہے ؎

جیسے جاتا ہے کوئی غیر کے گھر بھولے سے
کاش آجائے مرا یار ادھر بھولے سے

میر رشتہ شاگرد ذوق مرحوم بہت اچھا کلام تھا۔ اسیر کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ دعوے ہمہ دانی بہت تھا۔ مشہور ہے کہ آپ نے کسی اعتراض کی وجہ سے ہیرے کی انگوٹھی چبالی۔ لکھنؤ میں سنا جاتا ہے۔ کہ ہیر جابیلوں کے تکئے پر دفن ہوئے۔ ایک مطلع سننے میں آیا ہے۔

مہندی جو وہاں پر کفِ قاتل میں لگی ہے
یاں آگ ہمارے جگر و دل میں لگی ہے

آغا ہجو مندی مشہور شاعر تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اور یہیں دفن ہوئے "بوستان خیال" کا ترجمہ اردو انہوں نے کیا تھا۔ مزار کا پتہ معلوم نہیں ہوا۔

غیور تخلص دہلی کے رہنے والے میر تقی کے شاگرد لکھنؤ میں آئے سب سے پہلے ایک بنئے سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔ میرے یہاں پندرہ روپیہ ماہوار آپ کو مل سکتا ہے اور کھانا اور موٹا کپڑا۔ آپ نے کہا کہ میری گذر اس میں نہ ہوگی۔ اس نے کہا۔ اچھا آپ قیام کیجئے میں کسی سے آپ کی سفارش کردوں گا۔ دو مہینے تک قیام کیا۔ کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ آخر بنئے کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی جس کے چند شعر لکھے جاتے ہیں "جگل کشور" بنئے کا نام تھا ؎

عجب ایک منحوس بقال تھا　غرض صاحب ملک اور مال تھا
کوئی نام نحس اس کا لیتا نہ تھا　بجز گالیاں اس کو دیتا نہ تھا

بخیلی میں مشہور تھا اس قدر کہ قاروں کی جوتی تھی اور اس کا سر

۱۲۱۱ھ کا یہ واقعہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ میں نے بنیئے سے ملاقات کی اس نے کہا

ہمارے یہاں دال روٹی تو ہے — جو پوشاک پہنوگے موٹی تو ہے
اگر پانزدہ روپیہ ہوں قبول — تو ہر ماہ میں مجھ سے ہونگے حصول

آپ نے جواب دیا۔

کرونگا بھلا اس میں کیونکر معاش — مگر اور کہیں اب کروں گا تلاش

اس نے کہا آپ میرے یہاں مہمان رہیئے۔ میں کہیں کام دلوا دوں گا۔ آپ وہاں کئی مہینے تک رہے۔

رہا اس کی امید پر چند ماہ — بحال پریشاں بحال تباہ

نتیجہ یہ ہوا کہ آپ وہاں سے خفا ہو کر چلے آئے۔ اور اس کی ہجو لکھی۔ بعد چندے مرزا جعفر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔ وہاں سے کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا اگلے زمانے کے شعرا میں یہ صفت تھی کہ ذرا سی بات پر ہجو لکھ ڈالتے تھے۔ اور وہ زمانہ بھی قدردانی کا تھا۔ لوگ نازک مزاجیاں اٹھاتے تھے۔ ورنہ ایک بنیئے کا اردو زبان کی خدمت کے لئے کچھ روپیہ صرف کرنا قابل تقلید امر ہے۔ مگر غیور نے اس کی بھی قدر نہ کی انتقال لکھنؤ میں سنہ ۱۲۴۰ھ میں ہوا۔ مزار کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ غالب گمان یہ ہے کہ "مفتی گنج" میں ہوگا۔ کیونکہ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں یہ لکھنؤ آئے تھے۔ اور اس وقت کے تمام شعرا مفتی گنج میں زیادہ رہتے تھے۔ آج کل مغربی لکھنؤ ویران ہو رہا ہے۔ اس لئے وہاں کی قبروں کا نشان ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ سچ ہے۔

امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
مزار ہے نہ نشان مزار باقی ہے

آغا تخلص نام مرزا علی محمد عرف منے آغا صاحب۔ لکھنؤ سرائے میوہ میں رہتے تھے۔ جوانی میں مدقوق ہوگئے۔ علاوہ عربی فارسی کے انگریزی بھی جانتے تھے۔ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ بارہ بجے دن کو طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔ اولاد میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی۔ لوح مزار پر میر اعجاز حسین صاحب اعجاز لکھنوی کی یہ تاریخ کندہ ہے۔

چل رہا ہے خزاں کا جھونکا آہ — گل ہوئے ہیں چراغ کیا کیا آہ
ہائے کس کس کا سنیے صدا آہ — صورتیں چھپ گئیں ہیں صدہا آہ
بس چلے کیا قضا کے ہاتھوں سے — دق ہوئے ہیں جوان رعنا آہ
دیکھو نیرنگ گلشن فانی — ہے طلسم جہاں تماشا آہ
شیعہ خالص، برادر مومن — بے نظیر اور حسین رعنا آہ
دوپہر، پیر، چودھویں ذیقعد — ہوئی خالی سرائے دنیا آہ

مصرعہ سال ہو گیا اعجاز
ہائے صد حیف مُنّے آغا آہ

۱۶ ۱۳ھ

مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی نے بھی تاریخ وفات لکھی جو انکے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے

نحس خالی کی چودھویں تھی کلیم — ہائے مشفق مرے کہاں گئے آج
کہا ہاتف نے سال ہجری میں — منّے آغا سوئے جناں گئے آج

۱۶ ۱۹ھ

افسوس کہ آپ کا کلام دستیاب نہ ہوا۔ صرف چند اشعار نوحہ جات کے انتخاب میں آئے۔ مرحوم غزلیات بہت کم کہتے تھے۔

بانو کہتی تھیں با آہ و زاری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری
جن میں لٹتی ہے دولت ہماری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

ہائے سنتے نہیں میرے اصغر تم تو سوتے ہو جھولے کے اندر
ماں یہ کہتی ہے رو رو تمہاری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

واری کس سے کہوں اب میں جاکر کوئی باقی نہیں میرے سر پر
ظلم بے حد کریں گے یہ ناری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

ننھے ہاتھوں میں لے لو سپر کو چھوڑو تنہا نہ اپنے پدر کو
اٹھو بیٹا تمہارے میں واری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

شہ تو جنت کو آغا سدھارے رو کے کہتے ہیں سب انکے پیارے
کون لیگا خبر اب ہماری رن کو جاتی ہے شہ کی سواری

بین زینب یہ کرتی تھیں رن میں کارواں لٹ گیا میرا بن میں
منتظر ہو گی صغرا وطن میں کارواں لٹ گیا میرا بن میں

زینب نے کہا لاشۂ سرور سے لپٹ کر اے میرے برادر
کفناؤں میں کیوں کر تمہیں رکھتی نہیں چادر اے میرے برادر
آنکھوں کو ذرا کھول کے دیکھو تو ہیں واری بیت پہ تمہاری
روتے ہیں علی اور ہیں زہرا بھی کھلے سر اے میرے برادر

مشتاق تخلص نام مرزا بہادر علی عرف چھبّن صاحب خلف سنے آغا صاحب آغا مرحوم لکھنوی پہلے ان کا تخلص جوہر تھا۔ پھر زار اختیار کیا۔ آخر میں مشتاق تخلص پسند آیا قلمی دیوان انکے خاندان میں موجود ہے۔ ہر صنف شاعری پر قادر تھے۔ اُن کی تصنیف سے تاریخیں، رباعیاں مثنوی، قطعات، مخمس، مسدس، سب موجود ہیں۔ سید بندہ کاظم صاحب جاوید لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دالی محلے میں ماہواری مشاعرہ کی بنیاد بھی قایم کی تھی درسیات فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی میں بھی کافی قابلیت تھی۔ مدقوق ہو کر عین شباب میں ۱۲۔ ذیقعدہ ۱۳۱۹ھ دس بجے شب کو انتقال فرمایا۔ اور کربلائے تال کٹورہ میں۔ دفن ہوئے۔ اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا مسمی مرزا صادق علی عرف مچھن جس کی عمر صرف ایک ماہ ستائیس دن کی تھی۔ اپنی یادگار چھوڑا۔ باپ کی وفات کے گیارہ برس بعد لڑکے نے بھی مدقوق ہو کر ۱۳۔ صفر ۱۳۳۱ ہجری پانچ بجے صبح کو انتقال کیا۔ اور کربلائے عظیم الدولہ میں دفن ہوا۔ مشتاق مرحوم بہت منکسر مزاج خوش خلق آدمی تھے۔ افسوس کہ لوح مزار پر کوئی قطعہ کندہ نہیں ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

لکھا ہے وصف اکثر خال روئے شاہ ذیشاں کا ۔ نہ کیوں ہر نقطہ دُرِ بے بہا ہو میرے دیوان کا

بپا حشر ہو تو یہ ارمان نکلے ۔ کسی کا ہو ہاتھ اور دامن کسی کا

نہ ہوا آئیگی تربت میں نہ روزن ہوگا ۔ شمع روشن سے نہ روشن مرا مدفن ہوگا

زیرِ دیوار جگہ تھوڑی سی رہنے دیجیے
یاں کبھی آپ کے جانباز کا مدفن ہوگا

واہ دل کو مرے سینے میں سنبھلنے نہ دیا
کوئی پہلو ترے ناوک نے بدلنے نہ دیا

نہ مجھے زمیں و باقی نہ کبھی فشار ہوتا
پسِ مرگ آسماں پر جو مرا مزار ہوتا
تمہیں منعفی سے کہہ دو تمہیں کیوں دل اپنا دیتا
اگر اپنے دل پہ کچھ بھی مجھے اختیار ہوتا

اٹھا ہے جھوم جھوم کے ابرِ بہار آج
لا ساقیا پلا دے مئے خوشگوار آج

تری نگاہ نے بسمل کیا زمانے کو
یہ تیغ وہ ہے کہ جس کی کہیں پناہ نہیں
تمہاری گردشِ چشم سیہ نے مارا ہے
فقط میں گردشِ قسمت ہی سے تباہ نہیں

خطا پر ہے تمہارا تیر دیکھو
نگہ پڑتی ہے بے تقصیر دیکھو

بیکسی بعد فنا میری لحد پر مشتاق
رو کے کہتی ہے کہاں چھوڑ گئے تم مجکو

سرہانے وہ بیٹھے ہیں ہمارا دم نکلتا ہے
ٹھہر جا اے اجل اس وقت ان کا جی بہلتا ہے
خبر پاتا ہے اس ظالم کے آنیکی جو فرقت میں
تو رعبِ حسن سے مشتاق دل ہاتھوں اچھلتا ہے

اڑا رہی ہے صبا خاک جن مزاروں کی
وہ تربتیں ہیں تمہارے ہی خاکساروں کی
ابھی تو سینکڑوں کے دل لئے ہیں ضد کرکے
حضور لیجیے گا جان بھی ہزاروں کی

خارِ صحرا رہ گئے جب ٹوٹ کے
پاؤں کے چھالے بھی روئے پھوٹ کے
رہزنانِ عشق اے مشتاق آج
لے گئے اسبابِ راحت لوٹ کے

آہ کی باہم رسائی دیکھ لی — قسمت اپنی اور پرائی دیکھ لی
آپ کا مشتاق پیتا ہے شراب — خوب اس کی پارسائی دیکھ لی

اس سے بہتر اور کیا شے ہو نشانی کیلئے — دل لئے جاتا ہوں نذرِ یار جانی کیلئے

نکالو عاشقوں کی حسرتِ دیدار تھوڑی سی — ہٹا دو روئے روشن سے نقاب اے یار تھوڑی سی
خوشا قسمت زہے طالع اگر مشتاق لیتا جا — کفن میں خاک پائے احمد مختار تھوڑی سی

اک نظر پھر دیکھ لوں صورت وہ پیاری آپ کی — میرے کوچے سے اگر نکلے سواری آپ کی

بےخودی میں نہ قضا کو بھی قضا سمجھیں گے — شدتِ دردِ جگر کو بھی دوا سمجھیں گے
دست نازک سے مجھے ساغرِ مے بھی جو حلکو — تم اگر زہر بھی دوگے تو دوا سمجھیں گے
ساتھ لے جائیں گے مشتاق تخلص اپنا
اب نہ بدلیں گے اگر لاکھ برا سمجھیں گے

داغ تخلص نام مرزا سجاد علی عرف لڈن صاحب ابن منے آغا صاحب آغا مرحوم لکھنوی سرائے میوہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ درسیات فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی میں اچھی قابلیت تھی۔ ہندی میں اچھے ماہر تھے۔ عربی میں بھی کسی قدر دخل تھا۔ خوشنویسی کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ علمی مذاق کا شغل رہتا تھا۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ نثر بھی کبھی کبھی لکھتے تھے۔ عکسی تصویر بنانے کا کام جانتے تھے۔ ٹیلیگراف کا کام بھی جانتے تھے۔ لکھنؤ جنکشن (چارباغ) اسٹیشن پر بعہدہ ٹکٹ کلکٹری ملازم تھے۔ اس اثنا میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی جگہ پر ہردوار (یا کسی اور جگہ) تبادلہ ہو گیا۔ انہوں نے لکھنؤ کی جدائی منظور نہ کی اور مستعفی ہو گئے۔ عین شباب میں دفعۃً تپ دق میں مبتلا ہوئے۔ ڈھائی تین مہینے علیل رہ کر یکم جون ۱۹۱۰ء بدھ کے دن ساڑھے بارہ بجے دن کو انتقال فرمایا۔ اور کربلائے عظیم اللہ خاں میں دفن ہوئے۔ عمر تخمیناً ۲۴ یا ۲۵ سال کی تھی۔ ان کا کلام اکثر مختلف رسائل میں شایع ہو چکا ہے اپنا کلام جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اسی وجہ سے بہت زیادہ کلام ضایع ہو گیا۔ چند

غزلیں قلمی موجود ہیں۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

گلہ نہ آپ کا شکوہ نہ کچھ زمانے کا
سزا ہے پیار کی بدلہ ہے دل لگانے کا

کبھی کبھی رہے مشق ستمگری بھی ضرور
طریقہ بھول نہ جاؤ کہیں ستانے کا

بہانہ ساز، دغا باز، فتنہ گر، عیار
چھٹا ہوا ہے داغ ایک ہی زمانے کا

آیا تھا شب کو دھیان جو بوس و کنار کا
اترا ہوا ہے منہ سحر وصل یار کا

اٹھ اٹھ کے اسکی بزم میں بیٹھا ہزار بار
یارب بُرا ہو اس دل بے اختیار کا

خاک اس لئے اڑاتے ہیں وہ میری قبر کی
مطلب یہ ہے نشاں بھی مٹا دیں مزار کا

آئینہ لے کے دیکھ لو گر دوسرا نہ ہو
مغرور اپنے حسن پہ اے مہ لقا نہ ہو

میں بے قرار ہو کے جو لپٹا شب وصال
شرما کے بولے دیکھو کوئی دیکھتا نہ ہو

سمجھی تو کھوئے مرے پہلو میں دل نہیں
دیکھوں تو میں یہ شوخی دزدانہ ہو

کہتے ہیں لے کے کیا کروں افسردہ دل ترا
کس کام کا جو شوخ نہ ہو چلبلا نہ ہو

بلبل سمجھ کے کچھ پر پرواز کھولنا
بچھا ہوا ہے دام بھی گلزار کے قریب

اعجاز سحر ادا نے تمہاری دکھا دیا
کشتہ کیا نگاہ نے لب نے جلا دیا

اقرار میں یہ لطف نہ ملتا کبھی داغ
انکار وصل نے مجھے جیسا مزا دیا

صبح شب وصل آہ نظر تک نہیں ملتی
نیچی ہے نگہ اور وہ شرمائے ہوئے ہیں

تاثیر دکھائی کشش دل نے پس مرگ
سینے سے وہ تربت مری لپٹائے ہوئے ہیں

بڑھ گئی نام خدا ایسی محبت تیری
کہ اب آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری

وصل میں ان سے جو لپٹا تو کہا ہنس کے داغ
خیر ہے، خیر ہے، کیا آئی ہے شامت تیری

مجھکو اے چرخ کیوں کیا برباد کیا   میں نے آخر ترا کیا کیا تھا

پردے میں ان بتوں کے یہ ہے کون جلوہ گر   کس کے نیازمند ہیں اے بے نیاز ہم

نوحہ گر مجھ پہ نہ جب کوئی ہوا میرے بعد   روئی تربت پہ بہت میری قضا میرے بعد

جب یہ سنتا ہوں یار آتا ہے   دل کو کچھ کچھ قرار آتا ہے
لاکھ سمجھاؤ پھر نہیں سنتا   جب دل بے قرار آتا ہے

شمع روئی نہیں یاد وہ پریشاں نہ رہا   اے فلک کون ترے ہاتھ سے نالاں نہ رہا
لیجئے حضرتِ دل شوق سے چلیئے اب تو   غیر محفل سے نکالے گئے درباں نہ رہا
اک زمانے سے یہی عشق میں ہوتا آیا   دستِ وحشت مجھے کیا غم جو گریباں نہ رہا
تھی جوانی ہی پہ موقوف بتوں کی الفت   دل وہی ہے مگر اب دل میں وہ ارماں نہ رہا

پوچھوں گا پردے پردے میں ہم مٹ گئے اگر   تم کو بھی کچھ خبر مرے دردِ نہاں کی ہے

ہے غم حسین میں یہ اشک باری اے دماغ
وقفِ الم آلِ حیدر کرار آنکھیں ہو گئیں

افسوس میر شیر علی ابن میر علی مظفر خاں داروغہ توپخانہ شاگرد میر حسین علی حیران دہلوی۔ افسوس لکھنؤ میں ہمیشہ رہے۔ اور ان کی شاعری کو شہرت نہیں ہوئی۔ مرنے کے بعد نشان قبر بھی نہیں ملتا ہے۔

اس کی صورت کے تئیں یاد دلا دیتا ہے
بیٹھے بیٹھے مجھے یہ گل تو رلا دیتا ہے

میر اکبر علی اختر پہلے انجم تخلص کرتے تھے مصحفی کے شاگرد تھے۔ ایک زمانے میں مصحفی کا دل شاعری سے ایسا سرد ہو گیا کہ غزل کہنا ایک قلم ترک کر دیا۔ شاگردوں کو جواب دیدیا کہ مجھ سے غزلیں نہیں بنتیں۔ اختر سے بھی یہی کہا مگر اس نے بہت مجبور کیا تو ایک آدھ غزل پر

اصلاح دیکر ٹال دیا۔ شاگرد نے پوچھا پھر میں کس سے اصلاح لوں۔ کہنے لگے جرأت سے اصلاح لیا کرو۔ اختر جرأت کے پاس غزل لے کر آئے۔ آپ نے نام پوچھا تخلص پوچھا شاگردی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا مصحفی کا شاگرد ہوں۔ انہوں نے شاعری ترک کر دی ہے۔ آپ کی خدمت میں بغرض اصلاح آیا ہوں۔ اُستاد نے بھیجا ہے۔ فرمانے لگے سنو بھئی مصحفی میرا دوست ہے۔ میری اس کی مخالفت نہیں۔ میں تم کو اصلاح نہیں دے سکتا اگر تم ان کی تحریر لاؤ تو مضائقہ نہیں۔ آخر مصحفی نے خط لکھدیا۔ کہ آپ ان کو اصلاح دیا کیجئے۔ جب جرأت کے شاگرد ہوئے تو تیس برس کی عمر تھی۔ لکھنؤ میں انتقال کیا خدا جانے کہاں دفن ہوئے ؎

شمشیر جو کھینچے ہے قاتل اسے کہتے ہیں
تڑپے ہے جو میرا دل بسمل اسے کہتے ہیں

بقا شیخ بقاءاللہ خلف لطف اللہ عشق پہلے غمگین تخلص کرتے تھے۔ شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے کلام اچھا تھا۔ طبیعت شوخ تھی۔ لکھنؤ میں رہے اور یہیں انتقال کیا۔

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جسکی
یہ یقیں جانیو دل سے مرا قاتل ہے وہی

نواب مہربان خاں رند دہلوی جاہل تھے۔ اور تلفظ بھی درست نہ تھا۔ مرزا قتیل کے ساتھ لکھنؤ رستم نگر میں رہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ حاجی نصرت کے تکیئے میں دفن ہوئے

مرزا غلام جبار مجذوب ان کو سودا نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔

منتظر شیخ نور اسلام امروہوی شاگرد رشید مصحفی۔ ان کو استاد نے اپنا شاگرد رشید مانا ہے۔ اور لکھا ہے فن شعر سے خوب آگاہ ہے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اور وہیں دفن ہوئے ؎

ہر دم خیال یار جو پیش نظر رہا
ہجراں میں بھی وصال مجھے بیشتر رہا

شیخ الٰہی بخش معروف شاگرد رشید شاہ نصیر ابتدائے سن شعور سے لکھنؤ میں آئے۔ شاہ نصیر کے شاگرد رشید تھے۔ بہت اچھا کلام تھا۔ صاحب دیوان تھے لکھنؤ میں انتقال کیا اور گئو گھاٹ میں مدفون ہوئے۔

افسر غلام اشرف لکھنوی تلمیذ میر حسن دہلوی۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ نشان

قبر نہیں ملتا۔

ہوئے نصیب جلد کہیں وصل یار کا
احوال بے طرح ہے دل بے قرار کا

اسمیں جن شعرا کا کلام درج ہے انکے کلام کا انتخاب گویا عطر سخن ہے۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ بہت سے شعرا کے حالات باوجود بیحد کوشش کے بھی دستیاب نہ ہوسکے۔

نغاں۔ اشرف علی خاں عرف کوکا خاں احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکا تھے۔ اور ندیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں آئے تھے۔ پھر خدا جانے کس طرف چلے گئے۔ پرانے شاعر تھے۔ زبان بہت اچھی تھی۔ میر و میرزا کے معصر تھے۔

یک رنگ۔ غلام مصطفےٰ نام دہلی کے پرانے شاعر خوشگو میر و میرزا سے بھی پہلے کے شاعری میں خدا جانے کس کے شاگرد تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں نوکر تھے۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ اور اچھا کہتے تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ آئے تھے۔ پھر دہلی چلے گئے۔

محمد شاکر ناجی۔ دہلی کے پرانے شاعر محقق تھے۔ دہلی میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ بہت مشہور شاعر صاحب دیوان تھے۔

موزوں۔ میر فرزند علی دہلوی شاگرد رشید سودا بہت مدمغ آدمی تھے ابتدائی شاعری سے لکھنؤ میں چلے آئے۔ کسی سے ملتے نہ تھے۔ مشاعرے میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ غزل خوب کہتے تھے۔ مدت العمر لکھنؤ میں رہے۔ اور یہیں انتقال کیا۔ آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ ان کا سنہ وفات ۱۲۲۰ھ ہے۔ دیوان مختصر غیر مطبوعہ دیکھا گیا۔ اولاد کا پتہ نہیں ملتا۔

کسو کے قتل پر جو کمر اپنی وہ کستا ہے — ہمارا زخم دل بے اختیار اسوقت ہنستا ہے
تجھے مرے لہو کی ہے قسم جلدی سے لا ساغر — گھٹا اٹھی ہے ساقی کوئی دم میں مینہ برستا ہے
طریق کعبہ و بتخانہ بیگانہ ہے خطر زاہد — میانہ راہ چل مرد خدا سیدھا یہ رستا ہے

آجکا غذ بھی پر اس پر ناز کا اصرار ہے — ایک بوسے کیلئے ہم سے وہی تکرار ہے
کوتہ اندیشی کا ان دامن دراز و نکاہی تنگ — ہاتھ کا انکے گلے جو زخم دامندار ہے

پھر منالینگے اسکے روٹھنے کا ڈر نہیں گر خفا ہے کیا ہوا موزوں ہمارا یار ہے

ہوتا ہے عشق ظاہر یوں آہ دمبدم سے جیسے نشان لشکر معلوم ہو علم سے

اسی طرح دہلی کے ہزارہا شاعر لکھنؤ کی سرزمین میں سو رہے ہیں۔ جن کی قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔

آبرو نجم الدین عرف شاہ مبارک نبیرہ شیخ محمد غوث گوالیاری بہت خوشگو تھے۔ سراج الدین خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ آپ یک چشم تھے۔

ایک شاعر ان کی ملاقات کی غرض سے بہت دور دراز مقام سے آیا۔ غریب بہت کثیف الحال تھا۔ آپ نے کچھ اکتفانہ کیا اس نے مسکراکر کہا شاہ صاحب ہم غریبوں سے بھی تین آنکھ کیجئے۔ اس برجستہ گوئی پر سب ہنس پڑے اور شاہ صاحب نے معذرت چاہی۔ بہت جستجو کی مزار کا پتہ نہ ملا۔ ایک شعر درج ذیل ہے۔

دل تو دیکھو آدم بے باک کا
عشق سے بھرتا ہے تیلہ خاک کا

میر جیون افگار دہلوی۔ آپ نے مناقب بہت لکھے اور آخر وقت میں کربلائے معلی چلے گئے۔ اور روضۂ مقدسہ پر قرآن خانوں میں ملازم ہوگئے۔ لنگر خانے سے خیراتی شلہ کھانے کو ملا۔ خادم روضہ کو خواب میں بشارت ہوئی کہ ہمارے عزیز جیون کو طعام خاص دیا کرو۔ اس معجزے سے میر صاحب کی بہت تکریم کی گئی اور وہیں دفن ہوئے ؎

علی کا بیاہ ایسا جگمگا تھا
شب معراج جس کا رتجگا تھا

حیران میر حیدر علی دہلوی زندگی بھر لکھنؤ میں رہے۔ سروپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ حاجی نصرت کے تکیئے میں دفن ہوئے ؎

اپنے جانیکا واں دن کو نہ ہے رات کو ڈھب
دیکھئے کیسی بنے آن بڑی بات کو ڈھب

میر جعفر زٹلی دہلوی ہزل گو تھے پہلے رئیسوں کی مدح کرتے تھے جب ان سے کچھ وصول نہ ہوتا تو ہجو لکھتے۔ ہزل گوئی میں بہت مشہور تھے۔ اعظم شاہ کی مدح میں ایک مطلع

کہا تھا۔ جو بہت پسند ہوا۔ اور بیش بہا انعام حاصل کیا ؎

نگین سعادت کہ تابندہ بود

ہمیں اسم اعظم بروکندہ بود

ایک مرتبہ مرزا عبدالقادر کی ملاقات کو گئے۔ مرزا اس وقت پوچھا کیا کچھ فکر سخن میں ہو کہا ہاں۔ کہنے لگے میں بھی سنوں کہنے لگے نے کہا ایک مصرع اچھا ہے مگر دوسرا مصرع بہم نہ پہنچا وہ مصرع یہ ہے:

لالہ در سینہ داغ چوں دارد

آپ کہنے لگے واہ یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ لکھ لو ؎

جو یکے سبز زیر کون دارد

مرزا ہنسنے لگے اور کچھ دے کر ان کو رخصت کر دیا۔ دہلی سے جب آ۔ فیض آباد میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد میں چلے آئے ا انتقال کیا۔ نشان قبر نہیں ملتا۔

U523

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD